ڈاکٹر محمد اکرام خاں

ذاکر صاحب ـــ ایک معلّم

ایک عرصہ ہوا ذاکر صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ لیکن اُن کے غم کا داغ کسی صورت ہلکا ہوتا نظر نہیں آتا ہے۔ بلکہ کچھ ایسا لگتا ہے کہ وقت گزرتا رہے گا اور ذاکر صاحب کی جدائی کا غم شخصی اور قومی زندگی کے ہر جوڑ پر اُس شخص کو خون کے آنسو رُلائے گا جس کا کسی نہ کسی عنوان ذاکر صاحب سے تعلق رہا ہو۔

آج کے سب لوگ ذاکر صاحب کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ بہتوں نے اُن کو دور یا نزدیک سے اچھی طرح دیکھا ہے بہتوں نے ان کے ساتھ کام کیا ہے۔ بہتوں نے ان کی رہنمائی اور ہدایت کے مطابق اپنے فرائض منصبی کو بس بھرا نجام دیا ہے بہتوں نے اپنی زندگی ان کی ماں اور باپ جیسی شفقت سے بنائی اور سنواری ہے۔ بہتوں نے ان کی سرپرستی اور نگرانی میں تعلیم حاصل کی ہے۔ مجھے ان کے ایک حقیر شاگرد ہونے کا فخر حاصل ہے میں نے ان کو سدا ایک معلم کی حیثیت سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

یوں تو ذاکر صاحب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ لیکن ان کی تحریروں اور تقریروں ان کے افکار اور کردار ان کے اصولوں اور قدروں کا بیش بہا خزانہ قوم کے تعلیمی خزانوں میں محفوظ ہے۔ نئی نسلوں کے لوگ اس محفوظ خزانہ کے ذریعہ ذاکر صاحب کو جانیں گے۔ ذاکر صاحب کو سمجھیں گے۔ ذاکر صاحب کو پڑھ کر اپنے لیے آگے کی راہ تلاش کریں گے البتہ یہ ضرور ہے کہ ہر شخص اس خزانہ سے براہ راست فیض یاب نہیں ہو سکے گا۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ تحقیقاتی کام کرنے والے لائق اور اہل قلم حضرات ذاکر صاحب کے علم و فضل کی گہرائی، ان کی مذہبی اور فلسفیانہ نظر، ان کے اسلوب بیان اور طرز تحریر و تقریر، ان کے اصول تعلیم اور طریقۂ تعلیم۔ ان کی سیرت کی بلندی اور وقار، ان کی سیاسی

سوجھ بوجھ اور حسنِ انتظام ان کی حق پرستی اور انصاف پسندی اُن کی انسان دوستی، اور دلیش بھگتی، ان کی خدمت اور ایثار، ان کی دلچسپی اور ذوق کا تفصیلی مطالعہ کریں اور نتائج کو اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ دوسروں تک پہنچائیں۔ اس طرح نئی نسلیں ذاکر صاحب سے فیض یاب ہوسکیں گی۔

ذاکر صاحب نے زندگی بھر اپنے وطنِ عزیز کی خدمت کی ہے۔ خدمت ان کا وظیفۂ زندگی تھا۔ انھوں نے ایک مُعلم کی حیثیت سے قومی خدمت کے میدان میں قدم رکھا اور صدرِ جمہوریہ کی حیثیت سے اس سفر کو ختم کیا اور بالآخر اپنی جانِ جاں آفریں کے سپرد کردی (خدا اُن کو اپنی رحمتوں سے مالا مال فرمائے) ۱۹۲۰ء سے ۱۹۶۹ء تک ذاکر صاحب نے اَن گنت طریقوں اور حیثیتوں سے قومی خدمت کے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں لیکن انھوں نے اپنی معلّم کی حیثیت ہر قدم پر باقی رکھی ہے۔ اس حیثیت پر ہمیشہ فخر کیا ہے۔ شاید اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان کے دل کو سکون اور قرار اسی حیثیت میں زیادہ حاصل ہوا ہے۔ معلّم کی حیثیت سے انھوں نے صحیح معنوں میں صحیح اور صالح قدروں کی اشاعت اور قومی کردار کی تشکیل کی ہے۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں جے پور میں استادوں کے اجتماع کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

"میں دل سے آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے اس سمیلن کے موقع پر مجھے یاد فرمایا۔ آدمی کو شاید سب سے زیادہ خوشی اس سے ہوتی ہے کہ اس کی برادری کے لوگ اسے پسند کریں۔ میری برادری یہی شکشکوں کی برادری ہے۔ میں نے آج سے کوئی ۳۴۔ ۳۵ برس پہلے اس کام کو اپنایا تھا۔ اور اس لمبی مدت میں کبھی مجھے ایک آن کو یہ افسوس نہیں ہوا کہ میں نے یہ کام کیوں لیا۔ خاص مشکلوں میں مجھے یہ کام کرنا پڑا۔ شکشا کو نئے ڈھنگ پر ڈالنے کی کوشش میں لوگوں کی مخالفت بھی سہنی پڑی اور مخالفت کی گرمی سے زیادہ بے پرواہی کی ٹھنڈی مار بھی پڑتی رہی۔ مگر جی نے سکھ اسی کام میں پایا اور ساتھیوں اور شاگردوں کی محبت نے سب تکلیفوں کو بھلا دیا۔ آپ کا آج مجھے بلانا بھی انھیں تکلیفوں کا انعام ہے سچ یہ ہے کہ دیا کم ہے پایا زیادہ ہے۔"

ناز اٹھانے میں جفائیں تو اٹھائیں لیکن
لطف بھی ایسا اٹھایا ہے کہ جی جانے ہے

Y02

میں نے جب شکشا کے میدان میں قدم رکھا تھا تو وہ ہماری غلامی کا زمانہ تھا۔ ہم ایک پردیسی راج کی ایڑی تلے دبے ہوئے تھے۔ سامراج کی رسیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ پر وہ بڑی بے چینی اور ہلچل کا زمانہ بھی تھا۔ ہم غلامی کی رسیاں توڑنے میں اپنا سارا زور لگا رہے تھے ان رسیوں کو کاٹنے کی کوشش میں راشٹریہ شکشا کی کوشش بھی تھی۔ یہ ایک

Accession Number

کمزور سی کوشش تھی۔ میں بھی دوسرے ساتھیوں کے ساتھ اس میں لگ گیا۔"

ذاکر صاحب تعلیمی آدمی تھے۔ انھیں درس و تدریس میں لطف آتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے زندگی کا بہترین اور بیشتر حصہ معلم کی حیثیت سے گزارا ہے۔ وہ اسی حیثیت سے اپنا مقصدِ حیات حاصل کرنا چاہتے تھے اور یہاں انھیں اسی میں اپنا مقصدِ حیات حاصل ہوا ہے۔ علی گڑھ سے چلے آنے کے بعد کچھ تصنیف و تالیف کا کام کرنا چاہتے تھے کہ پنڈت جواہرلال نہرو نے انھیں راجیہ سبھا کا ممبر بنا دیا اور پھر ان کی عدم موجودگی ہی میں ان کو ریاست بہار کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔ ظاہر ہے ذاکر صاحب سے مشورہ ضرور کیا گیا ہوگا۔ لیکن ایک مبارکباد کے خط کے جواب میں انھوں نے ۳ جون ۱۹۵۷ء کو پیرس سے اپنے ایک شاگرد کو جو خط لکھا تھا وہ ذیل میں درج ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ گورنری کا عہدہ قبول کرتے وقت ذاکر صاحب کے اصل جذبات کیا تھے۔

"...... مبارکباد پر کیا لکھوں؟ کسی کو کوئی چیز بلا استحقاق مل جائے اور اس کا چرچا ہو تو وہ بے چارہ سوائے اس کے کہ شرمندہ ہو اور کیا کرے؟ لیکن آپ خوش ہیں اس لیے میں بھی خوش ہوں۔ کام میری ساری پچھلی زندگی سے لگا نہیں کھاتا ہے۔ لیکن انکار مناسب نہ تھا۔ دعا کیجیے کہ لاج رہ جائے۔ مگر آپ نے تو بہت سی امیدیں قائم کر لی ہیں؟ بستی بسنا کھیل نہیں۔ بستے بستے بستی ہے۔"

ذاکر صاحب نے بحیثیت معلم نجی طور پر ان گنت نوجوانوں کی زندگیاں علم کی روشنی سے منور کی ہیں۔ انھیں اپنے شاگردوں سے بے پناہ اور مستقل محبت تھی۔ ان کے یہاں استاد اور شاگرد کا رشتہ دائمی رشتہ سمجھا جاتا ہے وہ اپنے شاگردوں کی مدرسوں اور کالجوں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد بھی ہر آڑے وقت میں مدد فرماتے تھے۔ شاید ان کے دلِ بے قرار کو قرار ہی شاگردوں سے مل کر اور ان کی رہنمائی کر کے ملتا تھا۔ ایک خط کا ضروری حصہ ذیل میں درج ہے۔ یہ خط ڈاکٹر صاحب نے ۲۲ مئی ۱۹۵۹ء کو راج بھون، رانچی سے اپنے ایک شاگرد کے خط کے جواب میں لکھا تھا۔

"...آپ نے اپنی جو سرگزشت لکھی ہے اس سے رنج ہوا۔ اور اپنی بے بسی پر اس سے زیادہ رنج، یہاں کسی باہر کے آدمی کے لیے تعلیمی کام کا ملنا مشکل ہے۔ جب سے اپنا موجودہ کام سنبھالا ہے بوجوہ سفارشی خط لکھنا ترک کر دیا ہے۔ اب اگر کوئی مجھ سے کسی کے متعلق رائے دریافت کرتا ہے تو لکھ دیتا ہوں۔ لیکن بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مجھ سے دریافت نہیں کیا جاتا .... سفارش سے زیادہ مفید ایک مشورہ آپ کو دینا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ ہر آدمی کی زندگی میں ایک نہ ایک وقت آزمائش کا ہوتا ہے۔ بانصیب اس سے اپنی بہترین صفات کی

تربیت کا کام لیتے ہیں۔ بے نصیب تقدیر سے لڑتے ہیں اور اپنے دل کی تلخی سے اپنی زندگی خراب کرتے ہیں۔ خارجی دنیا جیسی کی ویسی رہتی ہے اور یہ غریب بگڑ جاتے ہیں۔ اپنی مشکلوں سے اپنے اندر تلخی پیدا نہ ہونے دیجیے۔ وقت کی اچھی صفتوں میں یہ بھی ہے کہ گزر جاتا ہے۔ اچھا ہی نہیں، برا بھی"۔

مجھے معلوم ہے کہ ذاکر صاحب مذکورہ بالا خط لکھنے کے بعد اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے جب تک اپنے اس شاگرد کو دہلی کے ڈائرکٹر آف ایجوکیشن سے کہہ کر یا کہلا کر ایک گورنمنٹ اسکول میں استاد کی حیثیت سے ملازم نہیں کرا لیا۔ یہ اس لیے لکھ رہا ہوں کہ وہ صرف نصیحت ہی نہیں کرتے تھے بلکہ صحیح معنوں میں ضرورت مندوں کی ضرورت بھی پوری کرتے تھے۔

قومی نقطۂ نظر سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب ہماری پوری قوم کے استاد تھے۔ انھوں نے ملک کی آزادی اور قوم کی ترقی کے لیے قومی تعلیم کا ایک مہمل خاکہ بنیادی قومی تعلیم کے نام سے پیش کیا تھا۔ انھوں نے جامعہ میں قومی تعلیم کا نصاب تیار کیا۔ اسے پرکھا اور پھر اس کے لیے ایک طریقۂ تعلیم تجویز کیا۔ اُن کی تقریروں اور تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کام کے ذریعہ تعلیم کو کتنی اہمیت دیتے تھے اور کیوں کام دراصل ان کے نزدیک تعلیم آدمی کے ذہن کی پوری پوری پرورش کا نام ہے اور وہ یہ پرورش کام کے ذریعہ تعلیم دے کر کرانا چاہتے تھے۔

۲۵ راکتوبر ۱۹۵۷ء کو پٹنہ سے ایک خط میں بڑی حسرت کے ساتھ تحریر فرماتے ہیں:۔

"..... لیکن بنیادی تعلیم کو لوگ نہ نظری طور پر سمجھتے ہیں، نہ اس کا عملی مظاہرہ ہی بہت اچھا ہو رہا ہے۔ بڑی محنت کا کام ہے یہ۔ ملک کا بڑا محسن ہوگا جو اسے کر ڈالے۔ نہ جانے یہ سعادت کس کے نصیب میں ہوگی۔"

ذاکر صاحب کی ذات میں اچھے استاد کی تمام تر خوبیاں اور صفات موجود تھیں۔ وہ عالم باعمل تھے۔ وہ سماجی آدمی تھے۔ وہ سب کا ادب کرتے تھے۔ بڑوں کا بھی ساتھیوں کا بھی، بچوں کا بھی، اور سب سے بڑی بات تو یہ کہ اپنا بھی، وہ صابر تھے اور مستقل مزاج وہ کتابوں کے عاشق تھے۔ وہ حساس تھے اور بے حد ذہین تھے۔ انھیں بچوں سے والہانہ محبت تھی۔ وہ دوسروں پر یقین رکھتے تھے۔ غرض یہ کہ ان میں ایک اچھے استاد کی ہر صفت بدرجہ اتم موجود تھی لیکن ذاکر صاحب کی سب سے زیادہ نمایاں اور قابلِ ذکر خوبی اور صفت یہ تھی کہ وہ شاگردوں کی بننے والی شخصیت کا رخ پہچان کر نہ صرف اس کی ترقی کے امکانات کا اندازہ کرتے تھے بلکہ اسے درجۂ کمال تک پہنچانے میں ہر ممکن مدد کرتے تھے۔

ذاکر صاحب ہر شخص سے بالخصوص اپنے شاگردوں سے ماں کی طرح غیر مشروط محبت کرتے تھے معلّم کی حیثیت سے ان کی بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ لوگوں کی سیرت کے بُرے پہلوؤں کو نظر انداز کرتے اور اچھے پہلوؤں کو ڈھونڈ نکالتے تھے اور ان کی کچھ اس طرح قدر و ہمت افزائی کرتے تھے کہ انھوں نے ہزاروں گرتوں کو تھاما ہے اور ہزاروں کو بھٹکنے سے بچایا ہے۔ اس سلسلے میں حسب ذیل خط ملاحظہ فرمایئے جسے انھوں نے "بچوں کا گھر" دریا گنج دہلی کے ایک سولہ سالہ طالب علم کے ایک خط کے جواب میں "گھر" کے نگراں کو راج بھون پٹنہ سے ۱۵ اکتوبر ۱۹۶۳ء کو لکھا تھا۔

" محبّی فاروق صاحب، السلام علیکم

جلیل میاں (بابو) کا ایک خط مجھے ملا۔ اس میں انھوں نے یہ لکھا ہے کہ وہ یہ خط آپ کی اور حکیم صاحب کی ہدایت کے مطابق لکھ رہے ہیں۔ چنانچہ جواب انھیں نہیں لکھ رہا ہوں۔ آپ ہی کو لکھتا ہوں۔ اگر خط انھوں نے آپ کی ہدایت پر نہ بھی لکھا ہو تو انھیں میری رائے بتا دیجیے گا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ میں شادی کے بارے میں کسی سے گفتگو نہیں کر سکوں گا۔ نہ پٹنہ میں نہ کہیں اور بابو نے پٹنہ میں کسی صاحب کی والدہ کا نام لکھا ہے۔ میں ان سے گفتگو کرنے سے معذور ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ میری رائے میں شادی کرنے سے پہلے میاں جلیل کو برسر روزگار ہونا چاہیئے۔ سوائے اس کے کہ کوئی دلہن انھیں ایسی ملے جو انھیں پالنے پر تیار ہو اور برابر پالتی رہے!

تیسری بات یہ ہے کہ اگر شادی کا ارادہ مصمم ہی کر لیا ہے تو صاحبزادے کو انتخاب میں بدیہی غلطی سے بچانے میں آپ، حکیم صاحب اور اکرام صاحب ان کی مدد فرمائیں۔ آگے اُن کی مرضی اور خدا کی مرضی۔"

اس تذکرہ سے ذاکر صاحب کی شخصیت، ان کی بڑائی اور ان کی تعلیمی خدمات کا صرف دھندلا سا اندازہ ہوتا ہے۔ ورنہ حقیقتاً ان کا ذکر تو ان کے دوستوں اور ساتھیوں کے قلم کی زبان سے سننے میں لطف آتا ہے۔ ان کی بڑائی کا اندازہ سچ پوچھیے تو ان تحریروں سے ہوتا ہے جو ملک کے باوقار اور قابلِ ذکر اشخاص کی ہیں۔ مثلاً خواجہ غلام السیّدین مرحوم جو خود بھی ایک کامیاب معلم تھے۔ اور جن کی شخصیت ایک حسین اور موزوں ترین مجموعہ تھی جامعیت، کلیت اور انفرادیت کا انھوں نے ذاکر صاحب کے ایک خطبۂ صدارت کو پڑھنے کے بعد انھیں لکھا تھا۔

" حبیب محترم "

ہوائی جہاز کا سفر اور قلم اشک افشاں۔ اس لیے قلم سرمہ سے لکھنے کی معافی چاہتا ہوں۔ اس سفر کے دوران میں علی گڑھ کا خطبۂ صدارت پڑھا۔ خلق الانسان علمہ البیان اور علی گڑھ گزٹ کا ذاکر نمبر۔ دل عقیدت سے لبریز ہے اور آنکھیں پُرنم اور قدرت سے یہ شکایت کہ جب وہ ایسی تخلیق کر سکتی ہے تو ہم جیسے خس و خاشاک پر طبع آزمائی کی زحمت کیوں فرمائی؟

آپ کا

"سیّدین"

۸-۳-۵۷

صفیہ پروین ۔ پبلک فرسٹ ایر

ڈاکٹر ذاکر حسین

"جدید ہندستان کے معمار"

مجھے لمحے نہیں، صدیاں سنیں گی
حفاظت سے میری آواز رکھنا

ڈاکٹر ذاکر حسین ایک عظیم شخصیت تھے۔ عظیم شخصیتیں وہ ہوتی ہیں۔ جو قوموں کی زندگی اور وقت کے دھارے بدل دیتی ہیں۔ ایسی شخصیتوں کی ذاتِ گرامی بہت سی قوتوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ ذاکر صاحب کی شخصیت بھی کچھ ایسی ہی ہمہ گیر تھی۔ وہ ماہر تعلیم بھی تھے اور اعلیٰ منتظم بھی، وہ ایک مدبّر بھی تھے اور سیاست داں بھی، وہ مجسم تہذیب و شرافت بھی تھے اور پیکرِ خلوص و متانت بھی، وہ اعلیٰ خطیب بھی تھے اور بلند پایہ ادیب بھی۔ ان کی زندگی کے کارناموں پر نظر ڈالی جائے تو سب سے بڑی خوبی اُن کا جذبۂ ایثار تھا۔ اسی جذبے نے ان کی شخصیت کو عظیم بنایا اور اسی جذبے نے انھیں منصب جلیلہ تک پہنچایا۔ جو دنیاوی زندگی کا نقطۂ عروج ہے۔ بقول پروفیسر آل احمد سرور ؎

"زمانہ جس کی تلاش میں تھا یہی ہے ہمدم، وہ مردِ داناں
نگاہ جس کی ہے عارفانہ ، مزاج جس کا قلندرانہ
وہ جس کا دستور حق پسندی، وہ جس کا آئین درد مندی
وہ جس کے ایثارِ بیکراں کا، ہے معترف آج تک زمانہ
جلال بھی ہے جمال بھی ہے، یہ شخصیت کا کمال کہیئے
خیال میں بجلیاں پر افشاں، لبوں پر اک دلربا ترانہ" [1]

ذاکر صاحب نہ صرف ایک ذہین اور ہونہار انسان تھے۔ بلکہ جذبۂ ایثار، قومی ہمدردی اور قومی یکجہتی بھی اُن کی شخصیت کے نمایاں پہلو تھے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے میں ذاکر صاحب کی قومی ہمدردی اور قومی یکجہتی کے پہلوؤں کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"ذاکر میاں نے قومی یکجہتی کے مسئلے پر کافی غور کیا ہے ان کے نزدیک قومی یکجہتی سے ایسا اتحاد مراد نہیں ہے کہ اجزاء کی انفرادیت فنا ہو جائے۔ وہ ہندستان کے مسلمانوں کو قابل قدر سمجھتے ہیں اس لیے کہ وہ قومی ورثے سے جدا نہیں ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ انھیں مسلمانوں کی ذمہ داری کا بھی احساس ہے۔ انھیں ملک و قوم کی خدمت میں اپنے آپ کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ نمایاں کرنا چاہیئے۔ اس کے بغیر وہ اپنی تہذیبی انفرادیت کو حق بجانب نہیں ٹھہرا سکتے۔" ۲۵

ترکی اور اٹلی کی جنگ کے دنوں میں ذاکر صاحب نے اسلامیہ اسکول، اٹاوہ کے ہوسٹل میں یہ تحریک چلائی تھی کہ طلبا گوشت کھانا بند کر دیں اور اس طرح جو روپیہ بچے وہ ترکوں کی مدد کے بھجوایا جائے۔ یہی نہیں وہ جمعہ کے روز نماز کے بعد مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر مظلوم ترکوں کے لیے اپنی ترکی ٹوپی میں چندہ جمع کیا کرتے تھے۔ اکثر مسجدوں میں اس کے لیے تقریریں کرتے تھے۔ خطابت انھوں نے اسی طرح سیکھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی تقریروں میں گھن گرج کے بجائے نرمی اور شیرینی پائی جاتی تھی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ذاکر صاحب کے تعلیمی خطبات میں بھی زبان کی یہی خوبی اور بیان کی یہی قدرت نمایاں معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ یہ خطبات مختلف مواقع کے لیے مختلف لوگوں کے اصرار پر ذاکر صاحب نے تیار کیے تھے۔ لیکن ان میں ہر ایک کا موضوع تعلیم کا کوئی بنیادی مسئلہ، کوئی اہم پہلو ہے اور مجموعی طور پر ان کا مقصد سچّی تعلیم سے روشناس کرانا اور اس کا یقین دلانا ہے کہ وہ کام جسے انجام دینا لوگ ایک خاص سرکاری محکمے کے ملازموں کا منصب سمجھتے ہیں خود ہر انسان کا سب سے بڑا اور سب سے اچھا کام ہے۔ ان تعلیمی خطبات کو پڑھیے تو ایسا محسوس ہوتا ہے۔ کہ ذاکر صاحب کو تعلیم کا پیغمبر بنا کر بھیجا گیا تھا۔ لیکن یہ بے حد افسوس کی بات ہے کہ ان کی امّت نے ہی اس سے روگردانی کی۔ جس کی سزا آج ہم سب کو بھگتنا پڑ رہی ہے۔ بہ الفاظ دیگر اساتذہ کی وہ جماعت جو آج اسکولوں اور کالجوں میں معلّمی کے فرائض انجام دے رہی ہے لیکن بس اس طرح کہ

ع سینہ خالی، آنکھیں ویراں، دل کی حالت کیا کہیئے

ذاکر صاحب نے آج سے چالیس پچاس سال قبل تعلیم کے بارے میں جو کچھ سوچا، جو کچھ کہا اور جو کچھ لکھا

اس سے اُن کا مطلب آنے والی نسلوں کے افراد میں سماجی شعور کو بیدار کرنا اور اخلاق کی تعمیر کرنا تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ تعلیم اور سماجی زندگی کا رشتہ آپس میں بہت گہرا ہے۔ اور دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ فرد کی تعلیم کا مقصد یہ کبھی قرار نہیں دیا جاسکتا کہ ہم اسے اکیلا آدمی تصور کرکے اس کے ذہن کی تربیت میں کوشاں ہوں۔ بلکہ تعلیم کا ایک اعلیٰ مقصد سماجی سیرت کی تشکیل ہے۔ جس کے ذریعہ وہ صرف فرد کی نہیں، انسانیت اور سماج کی بہتری کا کام انجام دے سکتا ہے۔ بقول ذاکر صاحب :۔

"اصلی چیز اور ابتدائی چیز سماج ہے۔ اکیلا آدمی، فرد اس کے سہارے اور اس کے بیے ہوسکتا ہے اور ہوتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اکیلا آدمی بطور جانور تو سمجھ میں آسکتا ہے۔ بلکہ پورے انسان کی حیثیت سے، جس کی امتیازی خصوصیت ذہن ہے، اس کا تصور بھی ممکن نہیں۔ ذہنی زندگی تو کسی ذہنی زندگی سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے ذہنی زندگی کے لیے جو اصلی معنوں میں انسانی زندگی ہے، سماج کا وجود لازمی ہے۔" ؎۵

انسانی ہمدردی اور شرافت ذاکر صاحب میں اسکول کے زمانے سے ہی بدرجہ اُتم تھی۔ وہ روزانہ ہوسٹل سے اٹاوہ اسٹیشن، جو قریب ایک کلومیٹر ہے، صرف اخبار خریدنے جایا کرتے تھے، جب وہ اخبار لے کر واپس آتے تو طالب علم ان کے چاروں طرف اکٹھا ہو جایا کرتے تھے اور وہ سب کو اخبار پڑھ کر سنایا کرتے تھے اور اکثر خبروں پر تبصرہ بھی کرتے تھے۔ اس طرح اُن میں اس زمانے کے قومی اور بین الاقوامی مسائل کے متعلق کافی بصیرت پیدا ہوگئی تھی۔ اسی بصیرت کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان میں ان معاملات کو سمجھنے کے لیے صحیح جذبات اور احساسات پیدا ہوگئے اور ان کے اندر نہ صرف قومی ہمدردی بلکہ انسانی ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوگیا۔ اگر خدا پرستی ان کا مذہب تھا تو خدمت خلق ان کا ایمان۔ وہ خدمتِ خلق کو عبادتِ الٰہی کا ایک ضروری اور بنیادی جزو سمجھتے تھے ذاکر صاحب کی ایک اور خوبی ان کی انسان دوستی تھی اور انسانی دوستی کی آزمائش اس وقت ہوتی ہے۔ جب کوئی شخص اعلیٰ مرتبہ پر پہنچ جائے اور اس کا سلوک عام انسانوں سے بھی اچھا رہے۔ ذاکر صاحب نے بلند سے بلند تر مقام حاصل کیا۔ لیکن ان کا سلوک معمولی انسانوں سے نہ صرف ہمدردانہ بلکہ فراخ دلانہ بھی تھا۔ جب بھی کوئی مہمان اُن کے یہاں قیام کرتا۔ تو ان کو سب سے زیادہ فکر مہمان کے خادم کی ہوتی تھی۔ وہ براہِ راست خادم سے پوچھتے کہ اسے کوئی تکلیف تو نہیں۔ ان کی اِسی اعلیٰ ظرفی کا اعتراف کرتے ہوئے پروفیسر رشید احمد صدیقی اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں کہ۔

"ذاکر صاحب ہمیشہ اور ہر حال میں، ہر شخص سے خوش ہو کر عزت و محبت سے ملتے تھے ملنے والے سے کبھی نہ اکتائیں گے۔ کسی بدنصیب کی آبرو ریزی میں دلچسپی لینا درکنار، اس خیال کو بھی ذہن میں نہ آنے دیں گے۔ انھوں نے کبھی احسان نہیں جتایا۔ بظاہر یہ بڑی معمولی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ بڑے ظرف و ضبط کا کام ہے۔" ۵۴

انسانی دوستی کا یہی جذبہ انھیں جامعہ ملّیہ میں باوجود حالات ناساز گار ہوتے کے کام کرنے پر اکساتا رہا۔ یقیناً ایک انسان دوست شخص ہی ان حالات میں جامعہ ملّیہ اسلامیہ جیسے ادارے کو چلا سکتا تھا۔ جب وسائل کا فقدان ہو، اپنوں کی مخالفت اور حکومت کے عتاب کا سامنا ہو، ایسا وہی کر سکتا ہے جسے انسانوں پر اور خود اپنی ذات پر مکمل بھروسہ ہو اور جسے انسانوں سے محبت ہو۔ انسان دوستی کے ساتھ ساتھ بلند اخلاق اور اعلیٰ شرافت بھی ذاکر صاحب کی عظمت کی خصوصیات میں سے تھیں۔ وہ اپنے چھوٹوں سے بھی جس طرح ملتے تھے اس کی مثال بھی بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ جب بھی ان کے چھوٹے ان سے ملنے جاتے تھے تو وہ انھیں رخصت کرنے کے لیے کمرہ سے باہر تشریف لاتے تھے۔ انھیں حفظ مراتب کا بھی بڑا خیال رہتا تھا۔ بقول سعیدہ صاحبہ:

"ان کی شخصیت کی اہم خصوصیات جو ان کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھیں اور جسے نہ جاننے والے کبھی کبھی ان کی کمزوری پر محمول کرتے تھے یہ تھی کہ وہ کسی کا دل نہیں دکھا سکتے تھے۔ بات چاہے چھوٹی ہو یا بڑی۔ ان کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ کسی کا دل نہ دکھے۔ کوئی آبگینہ ٹوٹ نہ جائے۔ کسی کا دل دکھانا ان کے نزدیک گناہِ عظیم تھا۔

مباش درپے آزار وہرچہ خواہی کن
کہ در شریعت ما غیر ازیں گناہے نیست" ۵۵

اس عظیم شخصیت کا ایک اور وصف انسان زندگی کی قدروں کی صحیح پرکھ میں نمایاں ہوتا تھا وہ ہمیشہ کام اور مقاصد کی قدر و قیمت کا بہت صحیح اندازہ لگا لیتے تھے۔ اسی پرکھ کی بدولت انھوں نے جامعہ ملّیہ میں ایسے ایسے یادگارِ زمانہ نادر جواہر اکھٹا کر لئے تھے۔ جن کو نہ صرف ان کے مقاصد سے دلچسپی تھی بلکہ ذاکر صاحب کی ذات سے بھی عقیدت تھی۔ جامعہ ملّیہ میں ایک مدت تک ایسے معلّم کام کرتے رہے۔ جن کو باہر بہترین مواقع مل سکتے تھے اور نجی زندگی میں اور زیادہ عیش و آرام میسّر آسکتا تھا۔ لیکن ان کے دل میں انھیں قدروں کی لگن تھی اور اسی

عشق کا چراغ روشن تھا۔ جو ذاکر صاحب کے سینے میں فروزاں تھا۔ بقول کسی شاعر کے :۔

یہ نہ سوچو کہ کوئی نقشِ قدم چمکے گا
اپنی منزل پہ پہنچنا ہے تو چلتے جاؤ

ذاکر صاحب نے ۱۹۶۱ء میں جامعہ کے جشنِ سیمیں کے موقع پر اکابرینِ قوم کو خطاب کرتے ہوئے اِن مایہ ناز ہستیوں کی خدمات کو یوں خراجِ عقیدت پیش کیا تھا۔

" جامعہ میں اگر کوئی تعریف کا مستحق ہے تو وہ میں بالکل نہیں ہوں، میرے وہ ساتھی ہیں جو اپنا نام کسی کو نہیں بتاتے اور دن رات ادارے کی خدمت میں جان کھپاتے ہیں۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ ان جیسے کارکن مشکل سے ہی کسی ادارے کو نصیب ہوں گے انھوں نے اس پچیس سال میں بہت کچھ سختیاں اٹھائی ہیں اور کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لائے۔" ۵۶

اس جلسے میں وہ تمام لوگ موجود تھے۔ جن کے اشاروں پر ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہونا تھا۔ اور وہ زمانہ تھا جب کہ فرقہ وارانہ جنون نے انسانیت کا چراغ تہہ داماں کر رکھا تھا۔ لہذا ذاکر صاحب نے اپنے خطبے کے دوران معلم کی جس انسان دوستی اور اس کی حق گوئی کا بیان کیا تھا۔ وہ اپنے آپ میں ان کے کردار کی ٹھوس حقیقت تھی۔ انھوں نے اکابرینِ قوم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ :۔

" آپ کی یہاں کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر میں تعلیمی کام کرنے والوں کی طرف سے بڑے ہی دُکھ کے ساتھ چند الفاظ عرض کرنا چاہتا ہوں آج ملک میں باہمی نفرت کی جو آگ بھڑک رہی ہے۔ اس میں ہمارا چمن بندی کا کام دیوانہ پن معلوم ہوتا ہے۔ یہ آگ شرافت اور انسانیت کی سرزمین کو جھلسے دیتی ہے۔ اس میں نیک اور متوازن شخصیتوں کے تازہ پھول کیسے پیدا ہوں گے؟ ..... خدا کے لیے سر جوڑ کر بیٹھیے اور اس آگ کو بجھائیے۔ یہ وقت اس تحقیق کا نہیں کہ آگ کس نے لگائی، کیسے لگی، آگ لگی ہوئی ہے، اسے بجھائیے۔ یہ مسئلہ اس قوم اور اس قوم کے زندہ رہنے کا نہیں ہے، مہذب انسانی زندگی اور وحشیانہ درندگی میں انتخاب کا ہے خدا کے لیے اس ملک میں مہذب زندگی کی بنیادوں کو یوں کھونے نہ دیجیے۔" ۵۷

ذاکر صاحب خوب سے خوب تر کے متلاشی تھے۔ تعلیم میں فضیلت کوشش یا درجۂ کمال کو پہنچنے کی تڑپ وایک اہم مقصد گردانتے تھے۔ ذاتی زندگی ہو، گرد و پیش ہو، تعلیم ہو، ہر ایک صورت میں یہی اصول ان کے

پیش نظر رہتا تھا۔ انھوں نے جارج کرشین اسٹائینز کی اس بات کو گرہ میں باندھ لیا تھا کہ:۔

"ایک تعلیم یافتہ شخص خود کو کبھی بھی مکمل محسوس نہیں کر سکتا۔ فطرتاً تعلیم کے لیے جدوجہد کرنا صحیح تعلیم کی ایک سچی نشانی ہے۔" ۵۸

ذاکر صاحب ہمیشہ زندگیوں کو سنوارنے اور سماج کو سدھارنے میں لگے رہے۔ انھوں نے جہاں تک اپنی ذات کا تعلق ہے احتساب نفس میں کبھی رعایت نہیں برتی۔ مگر دوسروں کے ساتھ عفو و درگزر کو ہی شعار بنایا۔ ان کی زندگی کے سب سے اہم بائیس ۲۲ سال ایثار و قربانی کی مثال قائم کرنے میں صرف ہوئے اور کم و بیش اتنا ہی زندگی کا آخری حصہ ملک کی بڑی بڑی ذمہ داریاں سنبھالنے میں گزرا۔ جب کہ وہ عظمت و شہرت کے میدان سر کرتے ہوئے بالآخر ملک کے سب سے بڑے عہدے پر فائز ہوئے۔ لیکن خواہ قلندری ہو یا خسروی۔ وہ کبھی اپنے فرائض سے غافل نہیں ہوئے۔ اس معلم، مفکر، دہاتما صوفی اور علم و عمل کے پیکر پر علامہ اقبال کے معزز بزرگ کے یہ اشعار کس قدر صادق آتے ہیں کہ ؎

پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں
ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضا تخلیق

انجمن میں بھی میسر رہی خلوت اس کو
شمع محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق

مثل خورشید سحر فکر کی تابانی میں
بات میں سادہ، وآزادی معانی میں دقیق

اس کا اندازِ نظر سارے زمانے سے جدا
اس کے احوال سے واقف نہیں پیرانِ طریق

حواشی

۱ ڈاکٹر ذاکر حسین (سیرت و شخصیت) صفحہ نمبر ۱۱۶ از عبداللطیف اعظمی — ذاکر صاحب کی ادبی خدمات /از پروفیسر آل احمد سرور

۲؎ ڈاکٹر ذاکر حسین (خراج عقیدت) صفحہ نمبر ۳۴ ذاکر میاں از ڈاکٹر یوسف حسین خاں
از ڈاکٹر تارا چند

۳؎ ذاکر صاحب کے تعلیمی خطبات صفحہ نمبر ۶۱
از باقر مہدی
(کتاب نما مئی ۱۹۸۳ء)

۴؎ موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال
از پروفیسر رشید احمد صدیقی
(نذر ذاکر از ڈاکٹر تارا چند)

۵؎ ذاکر صاحب کی کہانی صفحہ نمبر ۸۶
از سعیدہ خورشید عالم

۶؎ جامعہ کے پچیس سال : تعلیمی خطبات ۱۹۶۱ء صفحہ نمبر ۲۵۹
از ڈاکٹر ذاکر حسین

۷؎ جامعہ کے پچیس سال : تعلیمی خطبات صفحہ نمبر ۲۵۷
از ڈاکٹر ذاکر حسین

۸؎ نظریۂ تعلیم : حصہ دوم :
از جارج کرشین اشائیز صفحہ نمبر ۱
مترجم : ڈاکٹر قاضی عبدالحمید

افسانہ بیگم
بی۔ ایڈ

ڈاکٹر ذاکر حسین

"شخصیت اور سیاست"

ڈاکٹر ذاکر حسین کی "شخصیت اور سیاست" یہ ایک اہم موضوع ہے۔ جب یہ موضوع ہمارے ذہن میں آتا ہے تو سب سے پہلے یہ سوال اُبھرتا ہے کہ شخصیت کیسے کہتے ہیں؟

شخصیت ان جسمانی اور اخلاقی صفات کا ایک ہم آہنگ مجموعہ ہے جن کی بدولت کوئی شخص عام لوگوں سے امتیاز حاصل کرتا ہے اور ان پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ بات تو شخصیت کی تعریف ہی میں داخل ہے کہ وہ اپنے ماحول پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ایک جگہ اکبرؔ نے کہا ہے کہ۔

"مرد وہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں ـــــ" [1]

اور اقبالؔ نے جو شخصیت کو جسے وہ خودی کہتے ہیں خدائی کی حد کے قریب قریب پہنچا دیا ہے۔ مگر ایسے لوگ بھی ہیں جن کے نزدیک شخصیت سراسر اپنے زمانے یا ماحول کی پیداوار ہوتی ہے۔ عام طور پر تصوریت (IDEALISM) کے علم بردار اس کے قائل ہیں کہ شخصیت اپنے ماحول پر غیر محدود اثر ڈال سکتی ہے اور بہت بڑی شخصیتیں واقعی قوموں کی زندگی اور زمانے کے دھارے کو بدل سکتی ہیں۔

اس سرزمین پر کچھ ایسی شخصیتیں بھی رونما ہوئی ہیں جو تعلیمی، سیاسی، سماجی ـــ ہر میدان میں ممتاز حیثیت کی مالک ہیں اور جو کھری شخصیتوں کے مانند ہیں۔ ان کھری شخصیتوں میں سب سے قابلِ اہم نام جو ہماری توجہ

---

[1] ذاکر صاحب کی کہانی۔ سعیدہ خورشید عالم۔ صفحہ ۲۰۔

کو مرکوز کرتا ہے وہ ڈاکٹر ذاکر حسین کا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین ۸ / فروری ۱۸۹۷ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کا بچپن حیدر آباد میں گزرا اور وہ اپنے گھر کی چہار دیواری میں پلے بڑھے لیکن ریاست کی جاگیردارانہ آب وہوا سے متاثر نہیں ہوئے۔ طالب علمی کے زمانے میں ڈاکٹر ذاکر حسین بہت ہر دلعزیز تھے۔ ان کی تعریف کرنے والوں میں کسی کو گمان نہیں تھا کہ ان میں علم حاصل کرنے کا کوئی حوصلہ ہے۔ ان کی شخصیت میں بڑی کشش تھی ان کی گفتگو پر لطف تھی وہ بحث میں تیز تھے۔ ذاکر صاحب کی طالب علمی کی زندگی کے بہت سے رُخ ہیں اور ان کو ایک ہلکے خاکہ میں دکھا دینا ایسا ہی دشوار ہے جیسے ایک قیمتی نگینہ کے سب پہلوؤں کا ایک جھلک میں اندازہ کرلینا۔ ان کے ایک بہت گہرے اور بہت ہی قریبی دوست پروفیسر رشید احمد صدیقی ۔۔ کی تحریروں سے ان کی جو شکل ابھرتی ہے وہ کچھ اس طرح ہے کہ ۔۔

" ایک نوجوان ہے، نرم مزاج، لاابالی، بلا کا ذہین، مگر ذہانت اس کی دل نواز معصومیت کے پردہ میں چھپی ہوئی ہے۔ کھانے سے بے انتہا رغبت ہے باتیں کرنے میں مزے لیتا ہے، برتاؤ کرتا ہے تو انوکھا اور اپنے اوصاف سے پورے ماحول کو گرما دیتا ہے۔ کھانے کی دعوت میں جاتا ہے تو احباب سے فرمائش کرتا ہے کہ اسے تین منٹ پہلے کھانا شروع کرنے کی اجازت دی جائے، مگر وہ "نہیں نہیں" کا شور مچاتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اسے پہلے کھانا شروع کرنے کا موقع دیا گیا تو وہ سب کے سب بھوکے رہ جائیں گے۔ "[۱]

ذاکر صاحب کی شخصیت کا یہ ایک رخ ہے ان کی شخصیت بڑی نرالی ہے۔ جس کا دوسرا رُخ بھی پیش کرنا بہت ضروری ہے۔ وہ یہ ہے کہ ان کی شخصیت میں مرکزی اور بنیادی حیثیت جو انسان دوستی کو حاصل ہے۔ انسان دوست شخصیت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک مرشد و معلم کی دوسرے مصلح و مجاہد کی۔ اس میں مرشد و معلم کی سب سے اہم ہے۔ ذاکر حسین کی انسان دوستی اب تک مرشد و معلم کی شان رکھتی ہے۔ وہ انسان کو فرد کی حیثیت سے دیکھتے ہیں، اس کی روح سے محبت رکھتے ہیں اور اسے تعلیم وہدایت کے ذریعے سنوارنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

[۱] ڈاکٹر ذاکر حسین ۔ محمد مجیب ۔ صفحہ ۱۸ - ۱۷

"اچھے مسلمان پیدا کرو، اچھی اسلامی جماعت پیدا ہوگی، اچھے ہندستانی بناؤ اچھا ہندستانی بن جائے گا، لیکن وہ اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ معلّم کا مدرسہ ہو یا مرشد کی خانقاہ، دونوں کا اثر فرد کی تعلیم و ہدایت میں محدود رہے۔ دوسرے اجتماعی ادارے، خاندان، طبقہ، قوم، مذہب رسم و رواج اگر الگ الگ نہیں تو مل کر انسانی شخصیت کی تشکیل میں کہیں زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔" [1]

ذاکر حسین کی زیادہ یہ کوشش تھی کہ تعلیم کے ذریعہ قوم کی پستی کو اوپر اٹھانا تھا۔ جس کی کشش ان میں بچپن سے ہی تھی۔ وہ بچپن سے ہی قومی تعلیم کو آگے بڑھانے کے خواہاں تھے۔ انھوں نے اپنی بچپن کی تعلیم اٹاوے میں حاصل کی۔ اور پھر آگے تعلیم کے لیے ۱۹۱۳ء میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی چلے آئے۔ اور طالب علمی کے زمانے سے ہی وہ بیشتر جلسوں میں شرکت کرتے اور اکثر تقریریں کرتے رہے۔ اور یہاں تک کہ ۱۹۱۷ء میں یونین کے وائس پریسیڈنٹ منتخب ہو گئے۔ ۱۹۱۷ء میں ہی انھوں نے "ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم" کے موضوع پر ایک مقالہ لکھا اور سو روپے کا انعام حاصل کیا۔ اور دو سال کے بعد اقبال میڈل پایا اور پھر گورنمنٹ کا اسکالرشپ حاصل کیا۔ ذاکر حسین صاحب کچھ سالوں تک علی گڑھ میں رہے اس کے بعد ۱۹۲۰ء میں جب جامعہ ملیہ اسلامیہ وجود میں آئی تو ذاکر صاحب بھی دہلی آگئے۔ اور جامعہ کی ترقی اور نشو و نما کے لیے لگے رہے۔ وہ قومی تعلیم کے ایک گم نام خادم اور ایک چھوٹے سے تعلیمی ادارے کے سربراہ تھے۔ ایک بار ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے اپریل ۱۹۴۱ء میں جامعہ ملیہ میں بنیادی تعلیم کی دوسری کانفرنس کے موقع پر سیاسی رہنماؤں کے سامنے ایک تقریر کی تھی جس میں یہ اپیل کی تھی۔

"خدا کے لیے اس ملک کی سیاست کو سدھاریے اور جلد سے جلد ایسی ریاست کی طرح ڈالیے جس میں قوم، قوم پر بھروسہ کر سکے، کمزوروں کو زور آور کا ڈر نہ ہو، غریب، امیر کی ٹھوکر سے بچا رہے۔ جس میں تمدّن، تمدّن امن کے ساتھ پہلو بہ پہلو پھول پھل سکیں اور ہر ایک سے دوسرے کی خوبیاں اجاگر ہوں۔ جہاں ہر ایک وہ بن سکے جس کے بننے کی اس میں صلاحیت ہے اور وہ بن کر اپنی ساری قوّت کو اپنے سماج کا چاکر جانے۔ میں جانتا ہوں کہ ان باتوں کا

[1] ڈاکٹر ذاکر حسین۔ "شخصیت اور سیرت"۔ عبد اللطیف اعظمی۔ صفحہ ۲۴

کہہ دینا سہل ہے اور کرنا کسی ایک آدمی کے بس کی بات نہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ آج یہ بات ہمارے سیاسی رہنماؤں کے ہاتھوں میں اتنی ہے جتنی پہلے کبھی نہ تھی کہ کچھ سمجھ کر کچھ سمجھا کر، کچھ مان کر کچھ منوا کر ایسی ریاست کی نیو رکھ دیں۔ جب تک یہ نہیں ہوتا ہے ہم تعلیمی کام کرنے والوں کا حال قابل رحم ہے۔ ہم کب تک اس سیاسی ریگستان میں ہل چلائیں کب تک شبہے اور بدگمانی کے دھوئیں میں تعلیم کو دم گھٹ گھٹ کر سسکتے دیکھیں۔ کب تک ہم اس ڈر سے تھرّاتے رہیں کہ ہماری عمر بھر کی محنت کو کوئی ایک سیاسی حماقت، کوئی ایک سیاسی ضد بھسم کر دے گی۔ ہمارا کام بھی کوئی پھولوں کی سیج تو ہے نہیں، اس میں بھی بہت مایوسیاں ہوتی ہیں اور اکثر دل ٹوٹتا ہے۔ پھر جب ہمارے قدم ڈگمگائیں تو ہم کہاں سہارا ڈھونڈیں؟ کیا ایسے سماج میں جہاں بھائی ایک دل نظر نہیں آتے، کوئی قدر آخری قدر نہیں معلوم ہوتی۔ جس میں کوئی گیت نہیں جو سب مل کر گائیں، کوئی تہوار نہیں جو سب مل کر منائیں، کوئی شادی نہیں جو سب مل کر رچائیں۔ کوئی دکھ نہیں جو سب مل کر بٹائیں۔ ہماری یہ مشکل دور کیجیے اور جلد کیجیے اب بھی بہت دیر ہو چکی ہے اور دیر نہ جانے کیا دن دکھلائے۔" [1]

ڈاکٹر ذاکر حسین کچھ سالوں تک جامعہ ملّیہ اسلامیہ کی خدمت کرتے رہے ۱۹۴۷ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں کو، جب کہ ان میں شدید کشمکش تھی اور ایک دوسرے کی صورت دیکھنا بھی گوارا نہیں تھا۔ ذاکر حسین کی محبوب شخصیت نے جامعہ کے پلیٹ فارم پر اکٹھا کر دیا۔ اس طرح یہ ذاکر حسین کی شخصیت کی سحر کاری کہہ سکتے ہیں یا پھر ان کے ارادوں اور مقاصد کا خلوص، جو اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہتا۔ ویسے ڈاکٹر ذاکر حسین انڈین یونیورسٹیز کمیشن کے ممبر وہ ۱۹۴۸ء سے چلے آرہے تھے۔ ۱۹۵۰ء میں ذاکر حسین صاحب نیشنل کمیٹی کے چیئرمین منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں پریس کمیشن کے ممبر نامزد ہوئے۔ اپریل ۱۹۵۲ء میں وہ راجیہ سبھا کے ممبر نامزد ہوئے اور اپریل ۱۹۵۶ء میں دوبارہ ممبر نامزد ہوئے۔ ۱۹۵۷ء میں بہار کے گورنر ہوتے کے تھوڑے دنوں بعد اس سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد ۱۹۶۲ء میں نائب صدر کی حیثیت سے انتخاب کیا گیا۔ ۱۹۶۴ء میں الجیریا، مراکش خیرسگالی مشن پر گئے۔ اور کویت سعودی عرب، جارڈن، ترکی اور یونان مئی و جون ۱۹۶۵ء میں پہنچے۔ وزیر اعظم نہرو کا ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء میں انتقال ہوا سیاسی نظام ایک دم بکھر سا گیا۔ ذاکر حسین صاحب کو اس خبر کو سن کر بہت افسوس ہوا۔ اور ذاکر حسین نہرو کی

---

[1] ڈاکٹر ذاکر حسین "شخصیت اور سیرت"۔ عبداللطیف اعظمی۔ صفحہ ۱۴۸ - ۱۴۹

ملی برسی میں شامل ہوئے اور اس کی صدارت کی ۔ ۱۹۶۶ء میں لال بہادر شاستری دوسرے وزیراعظم بنائے گئے ۔ ۱۹۶۷ء میں صدر کا چناؤ کا الیکشن ہوا جس میں ذاکر حسین کا بھی نام تھا ۔ اور ذاکر حسین صاحب اس چناؤ میں ایک لاکھ ووٹوں کی اکثریت سے منتخب ہو گئے ۔ اور ۱۳ مئی ۱۹۶۷ء کو پارلیمنٹ کے سنٹرل ہال میں حلف وفاداری اٹھایا ۔ شری وی ، وی گری نائب صدر منتخب ہوئے ۔

ڈاکٹر ذاکر صاحب کی شخصیت ایک واحد اور نرالی شخصیت تھی ۔ دراصل ان کی شخصیت میں کوئی کایا پلٹ نہیں ہوتی تھی ۔ ایسا نہیں ہوا کہ وہ پہلے ایک زندہ دل نوجوان تھے اور بدل کر جوشیلے نیشنلسٹ ہو گئے یا جوشیلے نیشنلسٹ تھے اور ایسے معلم ہو گئے کہ جیسے تعلیم کے سوا دنیا کے کسی معاملے سے مطلب نہ ہو ، یا معلم تھے اور بدل کر ایک ناخدا بن گئے ، جو اپنے چھوٹے سے ادارے جامعہ ملیہ کو سیاسی طوفان میں سے بچا کر نکال لائے گورنر ہونے کے بعد یا وائس پریسیڈنٹ منتخب ہونے کے بعد وہ اور سب کچھ بھول کر حکومت کے ایک ممتاز رکن نہیں بن گئے ۔ ان کی زندگی ایک سیدھا سادا معاملہ ہے ۔ قدرتی صلاحیتوں کی بنا پر بیج کے پودے اور پودے کے درخت بنے ۔

ذاکر حسین نے یہ سوچا تھا کہ اپنی عمر کے بہترین سال قومی تعلیم کے لیے وقف کر دے گے ۔ لیکن کچھ حالات کی وجہ سے وہ ایسا نہیں کر سکے ۔ ذاکر حسین سیاست میں آنے کے بعد عوام کو قومی تعلیم کا درس دیتے رہے ۔ اور ان کا یہ ارمان یہ خواہش کہ ہمارے ملک کی زیادہ سے زیادہ قوم زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کرے ۔ ان کا کہنا ہے کہ ـــ تعلیم ہی کسی قوم کو زندگی کا سب سے اہم مقصد عطا کر سکتی ہے ـــ بقول غالب ۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارمان پھر بھی کم نکلے

ثریا پروین بی۔ایڈ

ڈاکٹر ذاکر حسین — ایک مطالعہ

جو عالم ایجاد میں ہے صاحبِ ایجاد
ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ
تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو
کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ

قدرت انسانوں کے معاملے میں کبھی اپنی جزرسی کا اظہار کرتی ہے۔ کبھی فیاضی کا۔ بیشتر انسان تو دل ودماغ کے اعتبار سے اس قدر گھٹیا ہوتے ہیں۔ کہ ان سے وجود کی مصلحت کو سمجھنا ہی مشکل ہے۔ لیکن کبھی کبھی قدرت بعض انسانوں کو ایسی فیاضی کے ساتھ نوازتی ہے، اور اپنے خزانے اِن پر بے دریغ نچھاور کرتی ہے۔ کہ عقل حیرت میں رہ جاتی ہے۔ اور ایمانی لو، زیادہ تیز ہوجاتی ہے۔ ایسے لوگوں کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ قدرت کے سامنے انسان کا کس قدر بلند تصوّر ہے۔

اس کم مایہ انسان میں وہ حیرت ناک امکانات موجود ہیں۔ جن کا جلوہ ہمیں کبھی کبھی بعض خاصانِ خدا کی ذات میں نظر آجاتا ہے۔ ان کو دیکھ کر ہمیں اس مدو افلاک سے بلند تر منزل کا سراغ ملتا ہے۔ جس کی طرف بڑھنے کی کوشش انسان ٹمٹماتی آنکھوں اور لڑکھڑاتے قدموں سے کرتا رہتا ہے۔ لیکن یہ راستہ اس قدر صبر آزما اور دشوار گزار ہے کہ ہزاروں مسافر ہر ہر قدم پر تھک کر رہ جاتے ہیں۔ صرف وہ تھوڑے سے لوگ اس منزل کے قریب پہنچ پاتے ہیں۔ جن کو تائید الٰہی حاصل ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے شخص کا شمار بھی ایسے لوگوں میں ہوتا ہے۔ جن کو قدرت نے صورت اور سیرت، دل اور دماغ شرافت اور دیانت، دوستی اور قیادت کی غیر معمولی صفات سے نوازا ہے۔ گویا یہ صفات ایک انسانی پیکر میں اس طرح ضم ہیں۔ جس طرح ہلال کی تنگ نائے میں بدر کامل کا جمال جہاں آرا پوشیدہ ہے۔ لیکن ان کی سادگی کو دیکھ کر یہ اندازہ نہیں ہو پاتا تھا کہ یہ شخصیت کتنی عظیم اور کتنی بلند ہے۔

(۱) ڈاکٹر ذاکر حسین ۱۸۹۷ء میں حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے ان کے والد فدا حسین خاں ضلع فرخ آباد (یو۔ پی) کے مشہور قصبے قائم گنج کے رہنے والے تھے۔ اور حیدرآباد میں وکالت کرتے تھے۔ قائم گنج کے پٹھان صدیوں سے سپہ گری کا پیشہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ محمد شاہ کے زمانے میں اس علاقہ میں افغانوں کی وسیع پیمانے پر تیسری آبادکاری ہوئی۔ آفریدیوں اور بنگشوں کے بہت سے خاندان آباد ہوئے۔ محمد خاں بنگش نے اپنے بیٹے قائم خاں کے نام پر قائم گنج آباد کیا۔ ذاکر حسین صاحب کے مورث اعلیٰ حسین خاں جو مدھ آخون (بڑے استاد) کے لقب سے مشہور تھے۔ اسی زمانے میں ہندستان آئے۔ یہ صوفی باصفا تھے۔ اور اپنے زمانے کے مشہور عالموں میں سے ان کے ہاتھ پر قائم گنج کے پٹھانوں نے بیعت کی تھی۔ ان کا مزار قائم گنج کے قدیم قبرستان نند دخاں میں ہے۔ ان کے بعد ان کی اولادوں نے سپہ گری کا پیشہ اختیار کیا۔ جو نسل در نسل چلتا رہا۔ ذاکر صاحب کے دادا غلام حسین خاں نے اپنی عمر کے آخری حصہ میں یعنی جب پنشن یافتہ ہوئے تو کاشتکاری اور باغات لگانے کا کام شروع کر دیا۔ غلام حسین خاں نہایت وجیہہ اور باوقار آدمی تھے اگرچہ دولت مند نہ تھے۔ لیکن دولت مندوں سے اپنی عزت کرانا جانتے تھے۔

ذاکر حسین صاحب کے والد فدا حسین خاں قائم گنج کے تحصیلی اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۸۸۶ء میں تلاشِ روزگار میں حیدرآباد چلے گئے۔ یہاں پر انھوں نے مرادآبادی برتنوں کی تجارت شروع کی۔ یہاں ایک وکیل صاحب سے ذاتی تعلقات کی بنا پر وکالت کا شوق پیدا ہوا۔ کچھ دوستوں کے اصرار پر وکالت کا امتحان دیا۔ جس میں اوّل درجہ کامیابی حاصل کی۔ پھر انھوں نے تجارت چھوڑ کر وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ اورنگ آباد میں دفتر کھول لیا۔ یہیں سے انھوں نے ایک رسالہ جاری کیا۔ جس میں حیدرآباد ہائی کورٹ کے نظائر شائع ہوئے تھے۔ "آئین دکن" کے نام سے یہ رسالہ عرصہ تک جاری رہا۔ پھر جب کافی شہرت پالی تو حیدرآباد چلے گئے۔ اور بیگم بازار میں دفتر قائم کر لیا۔ فدا حسین خاں صاحب کی سات اولادیں تھیں۔ سب لڑکے تھے۔ ان لڑکوں میں سب سے نمایاں ذاکر حسین خاں صاحب کی ذات شریف تھی۔

ذاکر حسین ۱۹۰۷ء میں تعلیم کے لیے اٹاوہ کے اسلامیہ ہائی اسکول میں بھیج دیے گئے۔ ۱۹۱۳ء میں ذاکر حسین ایم۔ اے۔ او کالج (جو اب مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ ہے) علی گڑھ میں داخل ہوئے انٹرمیڈیٹ انھوں نے سائنس میں پاس کیا۔ اور ۱۹۱۵ء میں بی۔ ایس۔ سی کا امتحان دینے کے لیے لکھنؤ کرسچین کالج میں داخل ہوئے۔ تاکہ میڈیکل کالج میں داخلہ لے سکیں۔ لیکن شدید علالت کی وجہ سے اس ارادہ کو ترک کر کے پھر علی گڑھ واپس آ گئے۔ اس طرح اُن کا ایک سال بیکار ہو گیا۔ پھر انھوں نے ۱۹۱۸ء میں بی۔ اے اور ۱۹۱۹ء میں اقتصادیات کے مضمون میں ایم۔ اے پری ویئس کیا۔ ایم اے کی تیاری کے ساتھ ساتھ ذاکر حسین اقتصادیات شعبہ میں جونیئر لیکچرار کے فرائض انجام دیتے رہے تھے۔ کہ علی گڑھ میں ترکِ موالات کا زلزلہ آیا۔ ۱۹۲۰ء میں جب گاندھی جی اور مولانا آزاد نے علی گڑھ کے طلبا کو ترکِ موالات کی دعوت دی تھی۔ اور مولانا محمد علی نے شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے دستِ مبارک سے جامعہ ملّیہ کا افتتاح کرایا تھا۔ تو یہ خیموں پر مشتمل درس گاہ تھی۔ ذاکر صاحب ایم۔ اے۔ او کالج چھوڑ کر خیموں کی بستی میں آ گئے۔ دو سال تک جامعہ ملّیہ اسلامیہ کی تعمیر میں مولانا محمد علی جوہر کا ہاتھ بٹانے کے بعد ۱۹۲۲ء میں ذاکر صاحب معاشیات کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے برلن پہنچ گئے۔ ۱۹۲۶ء میں ذاکر صاحب جرمنی سے ڈاکٹر ذاکر حسین بن کر لوٹے۔ اس وقت جامعہ کی حالت ٹھیک تھی۔ لیکن جب ۱۹۲۷ء میں حکیم اجمل خاں صاحب کا انتقال ہوا۔ تو جامعہ ملّیہ کا چلنا قریب قریب ناممکن نظر آتا تھا۔ حکومت کے عتاب کے باوجود جامعہ ملّیہ کو چلانا ہر ایک کا کام نہیں تھا جو ایثار ذاکر صاحب نے جامعہ ملّیہ کے لیے کیا وہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ ان دنوں ذاکر صاحب کو قریب قریب سبھی قومی لیڈروں سے سابقہ رہا۔ لیکن ان کی شخصیت پر قابل ذکر اثر صرف حکیم اجمل خاں اور مہاتما گاندھی کا پڑا۔ حکیم اجمل خاں کے خلق و مروت، صبر و قناعت کا اور گاندھی جی کی خلق بینی، حق شناسی، حق گوئی اور ہمہ گیر انسانیت نے انھیں کندن بنا دیا۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۸ء تک کا زمانہ ذاکر صاحب کے لیے بڑی آزمائش کا زمانہ رہا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد تین سال ذاکر صاحب کے لیے سخت روحانی کرب اور شدید جسمانی اور دماغی محنت کے تھے۔ اس عرصہ میں انھیں دلی کے مسلمانوں کی تباہی، اضطراب، مایوسی، ہراس، مصیبت، آزردگی، طیش کے جگر خراش مناظر دیکھنے پڑے۔ دوران سب کی یکساں خدمت کرنے والے مردوں اور عورتوں کے ساتھ اُن تھک کام کرنا پڑا۔

انھیں دنوں انھیں جامعہ ملّیہ کو اپنے معتمد ساتھیوں کے سپرد کر کے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کو اندرونی

اور بیرونی بیشمار خطروں سے بچانے کی جدوجہد کرنی پڑی۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۱ء تک کے وقفہ میں ذاکر صاحب نے اپنا سارا وقت اور توجہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کی خدمت میں صرف کیا۔ ۱۹۵۱ء سے ان مصروفیتوں کا دائرہ بڑھ گیا۔ ہندستانی پارلیمنٹ کے ایوان بالا، یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن اور اسی طرح کی بے شمار عارضی اور مستقل مجلسوں کی رکنیت، انجمن ترقی اردو (ہند) اور عثمانیہ یونی ورسٹی کی تنظیم نو کمیٹی کی صدارت، ان کے وقت کا بہت سا حصہ لیتی تھیں۔ ۱۹۵۹ء میں وہ علی گڑھ کی وائس چانسلری سے استعفیٰ دے کر کچھ دن خانہ نشین رہے اور پھر سوئزرلینڈ اور جرمنی میں علاج کراتے رہے۔ ۱۹۵۷ء میں پنڈت جواہرلال نہرو کے کہنے پر بہار کے گورنر ہو کر پٹنہ پہنچ گئے۔ ۱۹۶۲ء میں وہ جمہوریۂ ہند کے نائب صدر اور پارلیمنٹ کے ایوانِ بالا کے میرمجلس مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۷ء میں صدر جمہوریہ ہند کے اہم عہدے کے لیے ان کا انتخاب کر لیا گیا تھا۔ انھوں نے صدر کے عہدے پر اپنے فرائض بڑے خوش اسلوبی اور نیک نیتی سے انجام دیے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی وفات ۳؍مئی ۱۹۶۹ء کو ہوئی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین ایک ممتاز ماہر تعلیم کی حیثیت سے زیادہ جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی عمر کا بیشتر اور بہترین زمانہ تعلیم کی نذر ہوا۔ جدید ہندستانی تعلیمی نظام کی تشکیل و تعمیر میں اُن کے تعلیمی افکار کو بجا طور پر بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس موضوع پر ذاکر صاحب کے "تعلیمی خطبات" تعلیمی حلقوں میں مشہور و معروف ہیں۔ ان کی ایک کتاب (THE DYNAMIC UNIVERSITY) انگریزی میں ہے۔ جو تخلیقِ فکر کا قابلِ قدر نمونہ ہے۔ دراصل ذاکر حسین صاحب کو جرمنی کے قیام کے دوران جلا ملی۔ جو انھوں نے وہاں گہرے مشاہدے اور مطالعے سے حاصل کی۔ وہاں ان کی شخصیت پر دو عالموں کا گہرا اثر پڑا۔ جن میں ایک جرمنی کے مشہور آدمی KERCHAN STEINAR تھے۔ اور دوسرے مشہور عالم سوئستانی ماہر تعلیم PESTALOZZY تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین میں امتیازی شان یہ تھی کہ وہ جہاں تعلیم کے بنیادی اصولوں اور قدروں کی غیر معمولی پرکھ رکھتے تھے۔ وہیں ان میں یہ صلاحیت اور سلیقہ بھی تھا۔ کہ وہ ان کو عملی جامہ پہنا سکیں۔ ان کا بنیادی تصور تھا۔ کہ فرد اور جماعت میں گہرا رشتہ ہے۔ ذاکر صاحب نے اپنے خطبات میں بار بار اس بات پر زور دیا ہے۔ کہ تعلیم کو جماعتی تہذیب و تمدن اور اس کے مادی اور غیر مادی خزانوں سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ کیونکہ انسانی ذہن کو اپنی تربیت کے لیے جس غذا کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اسے جماعت کے تمدن اور اسی کی مادی اور غیر مادی تحصیلات ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس وقت ہندستان اپنے روائتی علم کا پجاری تھا۔ جہاں ہاتھ کے کام کو اکثر ذلیل سمجھا

تھا۔ پہلے ذات پات کی تقسیم اسی بنیاد پر قائم تھی۔ ایسے وقت میں اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانا بہت دشوار محسوس ہونا تھا۔ کہدینا الگ بات تھی۔ لیکن اس پر عمل مشکل تھا۔ لیکن ذاکر صاحب نے خود جامعہ ملیہ میں اس کی داغ بیل ڈالی جس وقت انھوں نے اس خیال کو پیش کیا۔ ان کے بہت سے ہم عصر اس اسکیم کے موافق تھے۔ اس کی وضاحت اپنے علم اور تجربے کی بنیاد پر ذاکر صاحب اس طرح پیش کرتے ہیں:۔

"ایک واقفیت وہ ہوتی ہے۔ جس کے لیے دوسرے کام کرتے ہیں، ہمیں بیٹھے بٹھائے مل جاتی ہے۔ خبر کی حیثیت سے ایک واقفیت ہوتی ہے۔ جو ذاتی کاوش اور ذاتی تجربے سے ہوتی ہے۔ جزو ذہن بنتی، ذہن کو روشن کرتی، اس میں نظر پیدا کرتی ہے .... روایتی خبر علم بے جان ہوتا ہے۔ اور بے نور، اس سے نہ دماغ کو روشنی نصیب ہوتی ہے، نہ روح کو بالیدگی، اکثر یہ نفس کی عیب پوشی کے لیے ایک خوش نما پردہ ہوتا ہے یا ایک خالی ظرف پر چڑھا ہوا چمڑا۔ آواز بہت دیتا ہے۔ اور اندر سے ہوتا ہے کھوکھلا۔ تجربے سے حاصل کیا ہوا علم انکسار پیدا کرتا ہے۔ اور ذہن کو تربیت دیتا ہے۔ روح کی پرورش کرتا ہے۔ اور ہمیشہ آگے بڑھنے کی طاقت بخشتا جاتا ہے۔ .... جس جماعت میں بہت بڑی اکثریت ہاتھ کے کام کو اپنا اہم شغل بنانے پر مجبور ہے۔ اس کی تعلیم گاہوں اور تربیت کے اداروں کو ہاتھ کے کام کی ہوا نہ لگنے دینا، کہاں کی دانش مندی ہے، سچ یہ ہے کہ قومی زندگی سے ایسی دوری اور اس کے واضح مطالبوں سے ایسی دوری اور اس کے واضح مطالبوں سے ایسی بے اعتنائی اسی وقت ممکن ہے۔ جب یہ مدرسے گنتی کے چند خود غرضوں کو اوپر بڑھانے اور اپنی جماعت کے سوادِ اعظم سے الگ کرنے کا ذریعہ ہوں۔"

اور پھر ایک اور جگہ اپنے بنیادی تعلیمی نظریے کے تحت کام کی اخلاقی سماجی، اور عملی اہمیت کو جس خوبصورتی کے ساتھ ذاکر صاحب اپنے خطبے میں بیان کرتے ہیں۔ بہت مشکل سے اس کی مثال ملے گی۔

"جو اپنی ہی غرض کا کام کرتا ہے، وہ ہنر مند ضرور ہو جاتا ہے۔ مگر تعلیم یافتہ نہیں ہوتا جو قدروں کی خدمت کرتا ہے، وہ تعلیم پا جاتا ہے۔ قدر کی سیوا میں آدمی کام کا حق ادا کرتا ہے اپنا مزہ نہیں ڈھونڈھتا، اس سے وہ آدمی بنتا ہے، اپنا اخلاق سنوارتا ہے.... ..... کام کی یہ صفت ہاتھ کے کام میں ہو سکتی اور دماغ کے کام میں بھی اور ہاتھ کے کام

میں بھی اس سے خالی ہوسکتا ہے۔ اور دماغ کا بھی کام کو تعلیم کا ذریعہ بنانے والوں کو ہردم یاد رکھنا چاہیئے کہ کام بے مقصد نہیں ہوتا کام ہر نتیجے پر راضی نہیں ہوتا، کام کچھ کر کے وقت کاٹ دینے کا نام نہیں، کام خالی دل لگی نہیں، کام کھیل نہیں، کام کام ہے، بامقصد محنت ہے کام دشمنی کی طرح اپنا محاسبہ کرتا ہے پھر اس میں پورا اُترتا ہے۔ تو وہ خوشی دیتا ہے جو کہیں نہیں ملتی، کام ریاضت ہے، کام عبادت ہے۔"

ڈاکٹر ذاکر حسین کی عظمت کا راز اسی میں ہی پوشیدہ ہے کہ انھوں نے عمر بھر کام کیا۔ اور اعلیٰ قدروں کی سیوا میں کام کیا ہے۔ اور اس وجہ سے ان کے کام کی اہمیت بہت بلند ہوگئی ہے۔ ورنہ صرف کام کرنے سے خواہ کتنا ہی اُن تھک کیوں نہ ہو۔ کوئی انسان اخلاقی بلندی تک نہیں پہنچ سکتا۔ ذاکر صاحب کی نظر میں تعلیم کا سب سے بڑا، سب سے اہم، سب سے بلند مقصد یہ تھا کہ وہ نوجوانوں کو سیوا کی زندگی کے لیے تیار کرے۔ اور اس غرض پرستی اور تنگ نظری کے خلاف جہاد کرے۔

ذاکر حسین کا مذہبی تصوّر بھی دوسرا ہے۔ وہ اسلامی درس گاہوں کی ناقص تعلیم پر بھی اعتراض کرتے ہیں ان کا کہنا ہے۔

"مذہب جو کہ صدیوں اس جماعت کی زندگی کا مرکز رہ چکا تھا۔ چھوٹتا تو کیسے، مگر اس طرح قائم رکھا جائے کہ دوسرے اداروں میں بھی مانع نہ ہو اور ترقی کی راہ میں حائل نہ ہونے پائے، معاملات پر کہ اہل دنیا سے متعلق ہیں، اس کی تعلیمات اور حکمتوں کو زیادہ نہ ابھارا جائے، چُپ چپاتے دوسرے زیادہ ترقی یافتہ اہلِ دنیا کے اسالیب عمل کو اختیار کر لیا جائے الّا عقائد و عادات پر زبانی زور رہے اور عملاً رخصت! اور ہاں! احساس مذہبیت کے باب میں خود فریبی کے لیے مذہب کے ان حصّوں پر جو ماورا ءعقل ہیں، عقلی بحثیں بھی ہوتی رہیں تو مضائقہ نہیں۔ یعنی بقول اقبال ؎

محو رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے

پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے"

ذاکر حسین صاحب نے یہ واضح کر دیا کہ تعصب، تنگ نظری، خود غرضی افراد اور جماعتوں کے لیے مضر حق کی حمایت انسان کا فرض ہے خواہ اس پر اپنوں کا ساتھ ہی کیوں نہ چھوڑنا پڑے۔ باطل سے جنگ ضروری

ذاکر صاحب جن قدروں کی اشاعت چاہتے تھے۔ وہ نہ صرف مسلمانوں اور ہندستانیوں کے لیے بلکہ عام انسانیت کے لیے قابلِ احترام جذبہ کارفرما تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے۔ جنھوں نے ہماری تعلیم اور ہماری نئی نسل کی ذہنیت کو ایک بہتر سانچے میں ڈھالا ہے۔

ذاکر صاحب نے بچّوں کی ذہنی و تعلیمی نشو و نما کے لیے بھی بہت کچھ کیا۔ ان کے زمانے میں بچوں کا کوئی ادیب نہ تھا۔ سوائے اسمٰعیل میرٹھی کے، ذاکر صاحب نے اس میدان میں بھی اپنے عملی گھوڑے دوڑانا شروع کر دیے۔ اور بچوں کی نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے بچوں کے لیے بہت سی کہانیاں لکھیں یہ کہانیاں اپنا ایک الگ مزاج رکھتی ہیں۔ یہ بچوں کے لاشعور میں بٹھاتی ہیں کہ آزادی کیا ہے؟ یہ بتاتی ہیں کہ اپنی مدد آپ کیسے کی جائے۔ ان کہانیوں کا اتنا سادہ اور پرلطف اندازِ بیان ہے کہ بچوں کے لاشعور میں یہ سبق آموز کہانیاں گھر کر جاتی ہیں۔ اور بچوں کی ذہنی نشو و نما میں بڑا فرق پیدا ہوتا ہے۔ انھوں نے عملی طور پر بھی اس کام کو کیا۔ جامعہ ملّیہ میں بچوں کے ساتھ مل کر صفائی ستھرائی کرتے، باغبانی کرتے، ڈرامے کرواتے، کھیل کرواتے، تقریری و تحریری مقابلے وغیرہ کرواتے۔ ایک دن جامعہ میں ایسا ہوتا جو مدرسہ کے نام ہوتا اس میں بچوں کے ساتھ ساتھ ذاکر صاحب ہر کام کرتے۔ تمام اساتذہ اور بچے ان کی پیروی کرتے، خود پڑھاتے بھی اور اس دن پڑھتے بھی۔ غرض ذاکر صاحب نے بچوں کی تربیت کے لیے بیحد کاوشیں کیں ہیں۔ ان کاوشوں میں وہ کامیاب بھی رہے جن کی زندہ مثال جامعہ ملّیہ ہے۔ ذاکر صاحب کی نظر میں استاد کا مرتبہ بھی بلند ہے وہ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ استاد اور شاگرد ایک ایسی ڈوری میں بندھے ہوں جو محبت اور خلوص پر مبنی ہو۔ ذاکر صاحب نے جامعہ ملّیہ کی جوبلی کے موقع پر اپنے خطبے میں استاد کے نصب العین کو پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ:-

"استاد کی کتاب زندگی کے سرورق پر علم نہیں لکھا ہوتا، محبّت کا عنوان ہوتا ہے اسے انسانوں سے محبت ہوتی ہے، سماج سے محبت ہوتی ہے اچھے استاد کی ذاتی زندگی میں وسعت بھی ہوتی ہے اور گہرائی بھی اور پائیداری بھی۔ اس کی روح میں حق و صداقت حسن و جمال، نیکی اور تقدس، انصاف اور آزادی کے مظاہر کی گرمی ہوتی ہے جس سے وہ دوسرے دلوں کو گرماتا ہے۔ اور جس میں تپا تپا کر اپنے شاگردوں کی سیرت کو نکھارتا ہے اچھے استاد میں اہلِ قوّت اور حکمرانوں کی سیرت کا ایک ذرّہ بھی نہیں ہوتا۔ اس میں اور

ان میں زمین آسمان کا فرق ہے، حکمراں جبر کرتے ہیں اور یہ صبر کرتا ہے، وہ مجبور کرکے ایک راہ پر چلاتے ہیں اور یہ آزاد چھوڑ کر ساتھ لیتا ہے۔ ایک کے وسائل میں تشدد اور زبردستی ہے، دوسرے میں محبت اور خدمت، ایک کا کہنا ڈر سے مانا جاتا ہے، دوسرے کا شوق سے ایک حکم دیتا ہے، دوسرا مشورہ وہ غلام بناتا ہے، یہ ساتھی، جب ساری دنیا مایوس ہو جاتی ہے تو بس دو آدمی ہیں جن کے سینے میں امید باقی رہتی ہے ایک اس کی ماں اور دوسرا اچھا استاد۔"

ذاکر صاحب نے جس طرح ایک معلّم کی حیثیت سے اپنی زندگی گزاری۔ اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ انھیں نوجوانوں اور بچوں سے بے اندازہ محبت تھی۔ انھوں نے بچوں کو انسانیت کے گر سکھائے۔ ان کی بیشتر کہانیاں بھی اس بات کا ثبوت ہیں۔ نوجوانوں کے لیے عملی قوت کا جذبہ اپنے اندر پیدا کرنے کا سلیقہ بنایا۔ آدابِ زندگی کا عملی نمونہ پیش کیا

غرض یہ کہ موصوف کی تعریف کی جائے یا ان کی صفات کو تحریر کیا جائے تو دفتر کے دفتر بھرے جا سکتے ہیں، لیکن پھر بھی تشنگی محسوس ہوگی۔ ذاکر صاحب نے ملک اور قوم کے لیے جو خدمات انجام دی ہیں۔ اس کا علم سب کو ہے۔ ان کی خدمت ملک کی ابتدائی تعمیر کا ایک اہم جز ہے۔ یہ خدمات ایسی تھیں کہ جن کو پنڈت جواہر لال نہرو اور مہاتما گاندھی جیسے عظیم لیڈروں نے تسلیم کیا ہے۔ بقول شخصے ؎

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آن
ہر کجا می نگری، انجمنے ساختہ اند

نجمہ سلطانہ
ایم۔ اے۔ بی۔ ایڈ

ذاکر حسین کی نظر میں قومی یکجہتی

آج ملک میں بھڑک رہی فرقہ وارانہ نفرت کی آگ شرافت اور انسانیت کی سرزمین کو جھلسے دے رہی ہے۔ اس چمن میں ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے پھول کیسے پیدا ہوں گے۔ کیونکہ اس بہیت کے بحران میں وہ نئے پودے بھی محفوظ نہیں ہیں جن سے ہمارا چمن خوشحال مستقبل کی آس لگائے رواں دواں ہے۔

اگر آج ذاکر حسین صاحب زندہ ہوتے تو ملک کے موجودہ حالات سے ان کے دل و دماغ پر کیا کیفیت طاری ہوتی؟

ہندستان کی متحدہ قومیت کے راستے میں طرح طرح کی رکاوٹیں ہیں۔ مذہب، ذات پات، تہذیب، زبان اور علاقے کی بنا پر شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔ آج کا انسان یہ بھول گیا ہے کہ ایک ہی بندوق کا نشانہ ہندو، مسلم اور سکھ بنے تھے۔ ایک ہی زمین پر خون بہا تھا۔ کیونکہ ایک ہی جوش تھا سب کی آواز یہی تھی کہ "ہندستان ہمارا ہے!" آج یہ "ہمارا ہندستان" اور ہندستان کے اپنے کس طرح ٹوٹ کر بکھر گئے ہیں۔ قومی یکجہتی اور ہم آہنگی قائم کرنے کی کوششوں پر پانی پھیر دیا ہے۔

ذاکر حسین صاحب فرد اور سماج کے باہمی رشتے کو ذہنی زندگی کی اصل سمجھتے تھے انھوں نے کہا ہے۔ "ذہنی زندگی تو بغیر سماج کے ممکن ہی نہیں . . . . ذہنی زندگی تو کسی ذہنی زندگی ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ چراغ کسی دوسرے چراغ سے ہی جلایا جا سکتا ہے۔ اسی لیے ذہنی زندگی کے لیے جو اصلی معنوں میں انسانی زندگی ہے۔ سماج کا وجود لازمی ہے۔ بدن میں ہر حصّے کی ضرورت ہوتی ہے مگر اسی حد تک کہ وہ کل جسم سے وابستہ رہے اور اسی کے اندر اپنی خدمت انجام دے رہا ہے۔ ایک حصّے کے کٹ جانے سے جسم میں کمی آجاتی ہے۔ مگر وہ باقی رہ سکتا ہے، مگر حصّہ جسم سے

الگ ہوکر باقی بھی نہیں رہ سکتا۔"

اسی لیے ذاکر حسین صاحب کے نزدیک آج کے بچے کا ذہن صاف ہوگا تب ہی وہ مستقبل کا سچا انسان بنے گا۔ اپنے وطن پر اپنا خون بہا کر فخر محسوس کرے گا۔

ذاکر صاحب نے آج کی بشارت دے دی تھی۔ "جب سماج کے قابو میں پوری معیشت آجائے گی اور جب وہ ذاتی ملکیت کے بجائے اجتماعی ملکیت ہو جائے گی صرف اسی وقت یہ ممکن ہوگا کہ ضمیر اجتماعی کا حالات محنت پر اختیار ہوگا۔"

آج ہم کو یہ نظر آرہا ہے کہ حقیقت میں سرمایہ دار اپنے مفاد کی خاطر دوسری تنظیمیں بنا رہے ہیں معلوم نہیں کہ ان کا ضمیر کب بیدار ہوگا اور خون کا رنگ کب پہچان پائیں گے۔ ہندستان میں اچھے لوگ تو ہیں لیکن صرف سیپ میں موتی کی طرح ہیں معلوم نہیں کب یہ سیپ سمندر سے باہر نکلے اور یہ موتی اپنی آب و تاب کے ساتھ اپنے وطن کا سچا سپاہی بنے۔

گاندھی جی بھی ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے گرویدہ تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ذاکر صاحب کو ہندو مسلم اتحاد پر پکا یقین ہے۔ ذاکر حسین صاحب کی زندگی کے رکھ رکھاؤ میں گاندھی جی کی شخصیت کا بڑا زبردست اثر تھا۔ ذاکر صاحب کی نظر میں کوئی مسلمان اچھا اور سچا مسلمان نہیں ہوسکتا تھا جب تک کہ وہ اچھا اور سچا ہندستانی نہ ہو۔ مسلمان کے لیے اچھا اور سچا مسلمان ہونے کے اس معیار پر پورا اترنے کے معنی یہ تھے کہ وہ قومی ترقی کے لیے جو کچھ بھی ضروری ہے سب کا سب اصولاً اور عملاً تسلیم کرے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک اچھا آدمی وہ ہے کہ جو مرتے وقت سماج کو اس سے بہتر حالت میں چھوڑے جس میں کہ وہ پیدا ہوا تھا۔ اس نظریے سے آج کے بچے کو اپنے مستقبل کی فکر کے ساتھ ساتھ اپنے وطن، اپنے پڑوس، اپنی قوم کے مستقبل کی بھی فکر کرنی چاہیئے کیونکہ آج کا بچہ ہی کل کا شہری ہوگا۔

یہی وجہ تھی کہ ذاکر حسین صاحب ایک استاد بننے کے خواہشمند تھے لیکن یہ ان کی طفلی خواہش تھی کیونکہ انھیں اپنے ماسٹر صاحب سے بہت محبت تھی ان کی نگاہ میں اپنے ماسٹر صاحب کی بہت عزت اور قدر تھی۔ بڑے ہونے کے بعد بھی ان کی طبیعت کا میلان بچوں اور نوجوانوں کی شخصیتوں کی طرف تھا۔ انھیں میں رہ کر انھیں راحت ملتی تھی ذاکر حسین صاحب کا کہنا تھا کہ "استاد کا اصلی کام سیرت کی تیاری ہے۔ اور ساری تعلیم کا بنیادی مقصد یہی ہوتا ہے کہ بچے کے ارادے اور عمل کی قوت کو کسی سیدھی راہ پر ڈال دے اور اصولوں کی روشنی میں اچھی عادتوں کی مدد سے

اس کی سیرت میں یکسوئی اور پختگی پیدا کر دے "۔

ایک اچھے استاد کے لیے ذاکر حسین صاحب کا نظریہ اس وجہ سے یہی تھا کہ ایک اچھا استاد ہی بچوّں کے ذہن کی ٹھیک ڈھنگ سے نشوونما کر سکتا ہے۔ جس میں مذہب پرستی، علاقہ پرستی کے خیالات دل میں جگہ نہ لیں۔ اور ہندستان کا ایک طالب علم ہندستان کا ایک وفادار سپاہی بنے۔

لیکن آج کل کے حالات میں جب بچے جنم لیتے ہیں تب ہی سے ان کی مائیں طفلِ زیرک ہی میں ان کے کانوں میں یہ زہریلی آوازیں ڈالنے لگتی ہیں کہ یہ ہندو ہے یہ مسلمان ہے۔ یہ سکھ ہے۔ یہ ہمارا ہے یہ تمھارا ہے۔ اگر آج کی ماں بھی اس عظیم انسان ڈاکٹر ذاکر حسین کی طرح ہو جائے یہی سوچے کہ ایک سچّا مذہبی انسان جب ہی پورا انسان بن سکتا ہے جب اس میں ایک سچا ہندستانی ہونے کے جذبات ہوں تو کیا ہی اچھا ہو۔

یہ عظیم شخص وہی ہے کہ جسے ایک مرتبہ جامعہ اسکول میں بچوں میں مٹھائی تقسیم کرنے کے دوران یہ اطلاع ملی کہ ان کی چہیتی بیٹی ریحانہ کا اچانک انتقال ہو گیا ہے۔ لیکن اس عظیم انسان نے بچوں کے درمیان سے جانا صرف اس لیے مناسب نہیں سمجھا کہ وہ بیٹھے ہوئے ان بچوں کی خوشی کو اچانک غم میں بدلنا نہیں چاہتے تھے۔

کیا آج کے انسان میں یہ جذبہ نہیں ہے؟ کیوں نہیں ہے — بلکہ بہت ہے۔ لیکن وہ صحیح جگہ اپنے جذبات کو استعمال کرنا نہیں جانتے۔

آج کا بھولا انسان ان بڑے بڑے اژدہوں کے بہلاوے میں آکر اپنے فرائض اور اپنے حقوق بھول جاتا ہے۔ اور وہ اژدہے دوسروں کو ڈسنے ڈسنے اس انسان کو بھی ڈس جاتے ہیں جو دھوکے میں آکر اپنا ایمان بھی کھا بیٹھا تھا۔

کیا ذاکر حسین صاحب کی روح کو آج کے حالات دیکھ کر سکون و چین نصیب ہوگا۔ یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ جس مرا نہیں کرتیں وہ سب دیکھتی اور سنتی رہتی ہیں۔

اگر آج ہم اپنے ملک، اپنی قوم، اپنے بھائی، اپنے استاد کی عزت کریں ان کے وفادار رہیں۔ اپنے فرائض پہچانیں تو آج بھی ہندستان میں ہم ایک نیا ذاکر حسین پیدا کر سکتے ہیں۔ ہم نے اس چمن کے ہر پھول کو اپنے خون سے رنگین کیا ہے اپنی سانسوں سے خوشبو دی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ گلزار اپنے پیدا کیے ہوئے پھولوں سے جھلس جائے۔

यत्न करने पर भी कोई अनियमितता या छिद्र नहीं ढूंढ पाते। आपने उत्तम चरित्र, उत्तम मूल्यों, उत्तम आदर्शों व उत्तम सामाजिक सम्बन्धों की महत्ता का वर्णन स्थान स्थान पर किया है। यह भी सच है कि आपने प्रेम, भाई-चारे के साथ ही साथ कई बार बहुत ही खरी-खरी बातें भी कही हैं, जैसे "बेमन से बुनियादी तालीम को चलाने से तो बेहतर है उसको खत्म ही कर देना", "बुनियादी उस्तादों ने ही बुनियादी शिक्षा का जनाजा निकाल दिया है", "देश का नेतृत्व घटिया किस्म का है इसीलिए तो शिक्षा का दिवाला निकल रहा है", आदि, आदि।

हमारे शिक्षा संकाय में वर्षों से सीढ़ियों के सामने आपका एक भव्य तैल चित्र आज भी लगा है। जब आप जामिआ के उपकुलपति थे तब का यह चित्र रहा होगा। उसमें चित्रित आपका रोबीला मांसल चेहरा, मादक नेत्र, व सादा किन्तु गौरव गरिमा-युक्त परिधान आपकी युवावस्था, आपके युवा स्वप्नों, आपके दृढ़ निश्चय और कर्मठ जीवन की मनोहर कहानियों का तत्क्षण स्मरण करा देता है। मैं जब कभी आपका वह सर्वोत्तम चित्र देखता हू तो कई प्रश्न एकाएक मेरे मस्तिष्क में उमड़ पड़ते हैं। बहुत जी चाहता है किसी से उन प्रश्नों को पूछू—कई बार प्रो० मुजीब, डा० सलामतुल्ला साहब, और कई साथियों से उनमे से कुछ प्रश्न पूछने का प्रयास भी किया था। लेकिन चूंकि ये सब प्रश्न आप से ही आपके सम्बन्धित रहे हैं, आपसे ही इन्हें पूछने को दिल चाहता है।

जब आप जामिआ रूपी पौधे को पानी देकर सींचते रहे थे—बाईस वर्षों तक, तब आप निश्चय ही एक यूटोपियन शिक्षा संस्था की रचना का स्वप्न देख रहे होंगे और उस स्वप्न को कार्य रूप में परिणित करने का प्रयास कर रहे होंगे? आपकी उस युटोपियन संस्था में राजनीति को क्या स्थान था? क्या उसमें भी प्रोफेसर, रीडर और लेक्चरर के पदों और उनसे सम्बद्ध सामाजिक-मनोवैज्ञानिक तनावो के अस्तित्व की कोई गुंजाइश थी? आप किस टेकनीक से प्रशासन चलाते थे? यहां तब क्या आप एक लोकतांत्रिक नेता थे, या एक करिश्मा दिखलाने वाला व्यक्तित्व (केरिस्मैटिक परसेनेलिटी) थे, या एक तानाशाह थे? क्या आपके उस स्वप्न ससार में विद्यार्थियों को भी तोड़-फोड़ करने और नौजवानी के आधुनिक भारतीय करिश्में दिखलाने का कोई अधिकार था? क्या आपके युटोपिया में कानूनी न्यायालयो को भी कोई स्थान मिला था? क्या जामिआ नगर ओखला के अधिकांश निर्धन, अशिक्षित, अल्प सस्कृत व दुखी निवासियो की सेवा करने के लिये जामिआ की भूमिका के सम्बन्ध में भी कोई विचार उस स्वप्न चित्र में थे? आपने शिक्षा-सम्बन्धी विषयों पर जो कुछ लिखा है उसमें मुझे मेरे इन कुछ अटपटे प्रश्नों के उत्तर नहीं मिलते। किसी से पूछता हूं तो भी जो भी उत्तर मिलते हैं वे भी अस्तव्यस्त होते हैं। पता नहीं, आप इन पर क्या प्रकाश डालना पसन्द करते? इतना मैं अवश्य कहना चाहूंगा, यदि इन प्रश्नों के लिये आपके शैक्षिक विचारों में आपके युटोपिया में कोई स्थान नहीं रहा है, तो उनमें यह एक न्यूनता ही कही जायेगी। आप इस छोटी सी आलोचना से अप्रसन्न तो नहीं होंगे? नहीं, आप नहीं होंगे, ऐसा मुझे विश्वास है, क्योंकि आपके विचारों में उदारता, सहिष्णुता, और बौद्धिक समालोचना को उचित स्थान प्राप्त था।

ज्यादती से "इसे मिर्जा फोया बनाइए, न ऐसा कि आपकी कठोरता के कारण वह जिन्दगी या कम से कम आदमियों से ही घृणा करने लगे।" "अच्छे अध्यापक की सबसे पहली और सबसे बड़ी पहचान यह है कि इसकी स्वाभाविक प्रवृत्ति बच्चों और नवयुवकों के विकासोन्मुख व्यक्तित्वों की ओर होती है। उन्ही में रह कर इसे सतोष मिलता है, उनके बिना दुनिया में यह परदेसी की तरह भटकता फिरता है।" आपके ये वाक्य तब से ही मेरे स्मृति-पटल पर पक्की स्याही से लिखे गए हैं। और हां, लम्बी सफेद दाढ़ी वाले उस बूढ़े की कहानी, जिसमें एक बालिका के एक छोटे से जिज्ञासा भरे प्रश्न "बाबा, जब आप सोते हैं तो आप दाढ़ी लिहाफ में अन्दर रखते या बाहर ?" ने उसे रात भर इस अजीब उधेड़बुन मे डाल दिया था कि वह दाढ़ी लिहाफ के अन्दर में रखे या बाहर, जो आपने उस पुस्तक मे लिखी थी, को मैं अब तक नहीं भूल सका हूं। "थाली में लुढ़कने वाले बैंगन", "मूर्ख पुजारी", "आशा की किरण" आदि जो जो विशेषण आपने शिक्षकों के लिए प्रयुक्त किये थे वे मेरे जैसे नौजवान शिक्षक को तब झकझोरने के लिये पर्याप्त रूप से प्रभावपूर्ण थे। अब तक नही भूल सका हूँ मैं आपके उन सभी विद्युतमय शब्दों को।

1967 में जब मैं राष्ट्रीय शैक्षिक अनुसंधान व प्रशिक्षण परिषद, नई दिल्ली में काम कर रहा था, मेरे एक साथी डा० राजेन्द्र पाल सिंह (जो तब आपके शिक्षा सम्बन्धी विचारों पर एक पुस्तक लिख रहे थे) के साथ जामिआ के उपकुलपति व आपके अनन्य मित्र व सहयोगी प्रो० मुजीब से आपके बारे में बातचीत करने आये थे। वे मुझे भी साथ में लेते आये। प्रो० मुजीब ने डा० सिंह के प्रश्नों के उत्तर में आपका जो रोचक शब्द-चित्र प्रस्तुत किया था वह उस चित्र से मेल खा रहा था जो मेरी स्मृतिपटल पर आपके बारे में 1956 की उस रात्रि को ही उभर चुका था। "जाकिर साहब · बड़ा जोश था उनमें, बहुत जल्दबाजी थी, एक काम को हाथ में लेते थे, तुरन्त दूसरे को लेने की सोचते थे, थकना जानते न थे, जबरदस्त माद्दा था उनमें काम करने का, औरों को उत्साहित करने का। अपनी बात मनवाने का, लोगों के दिलों को जीत लेने का।·· निहायत शराफत थी·· एक बिरादरी की भावना और लगन से सबके साथ सलूक करते थे···" आदि, कई बातें मुजीब साहब ने आपके बारे में कही थी।

फिर आप जब राष्ट्रपति बने तो पत्र-पत्रिकाओं में आपके विषय में बहुत से लेख व संस्मरण छपे। इस बीच मैंने आपकी "भारत में शिक्षा का पुनर्निर्माण" और कुछ विश्व-विद्यालीय दीक्षांत समारोहों के भाषणों व लेखों को भी पढ़ा था। मुझे ऐसा लगा है कि आपने अपने जीवन के आरम्भिक वर्षों में एक शिक्षा-मनोवैज्ञानिक की जैसी सूझबूझ का ही अधिक परिचय दिया था, लेकिन धीरे-धीरे आपका दृष्टिकोण सांस्कृतिक पक्ष की ओर अधिक झुकता चला गया और आप मेरे विषय समाजशास्त्र की भावना के पर्याप्त निकट आते गये। आपका नाम एक महान उदारवादी और सांस्कृतिक मूल्यों के महत्व को समझने वालों में अग्रणी के रूप में लिया जाने लगा। धर्म-निरपेक्षता, धर्म, संस्कृति, मुसलमानों की तालीम—इन सारी पक्षों पर आपने जो कुछ लिखा और बोला है, उसमें आलोचक तत्त्व

स्वर्गीय डा० जाकिर हुसैन साहब के नाम एक पत्र

जामिआ मिल्लिया इस्लामिया,
नई दिल्ली-25.
जनवरी 24, 1987.

परम आदरणीय डाक्टर साहब,

आदाब अर्ज । बहुत दिनों से आपको पत्र लिखने का विचार दिल में उमड़ता-घुमड़ता रहा है। मैं जामिआ मिल्लिया इस्लामिया में एक शिक्षक हूं। मैं उन सौभाग्यशाली व्यक्तियों में से नहीं हूँ जिन्हें आपके 22 वर्षीय उपकुलपतित्व की अवधि मे आपके महान नेतृत्व में शिक्षक होने का अवसर मिला हो या जिसे आपके द्वारा सचालित शिक्षा संस्थाओ मे विद्यार्थी होने का गौरव प्राप्त हुआ हो। सच तो यह है कि आपके निकट दर्शन तो मुझे केवल उसी दिन हुए थे जबकि आप अनेक वर्षों पूर्व गणतन्त्र दिवस समारोह के अवसर पर झांकियों के जलूस को देखने के लिए इण्डिया गेट पर राष्ट्रपति की बग्घी से उतरे थे। श्रीमती गांधी ने आपका स्वागत किया था और तब आप बड़े राजनैतिक नेताओं और अधिकारियों की भीड़ मे तुरन्त ओझल हो गए थे। उस एक क्षण की आपकी छवि आज भी मेरे मस्तिष्क के स्मृति-पटल पर थिरक रही है। सौम्यता, गौरव और विशालता की आपकी वह छवि बार-बार स्मृति पटल पर आती है।

मैंने चाहे आपको निकट से इतना अल्प रूप में ही देखा हो, लेकिन सच तो यह है आपसे मेरा परिचय परोक्ष रूप में बहुत पहले हो चुका था। आज भी मुझे वह रात याद आती है जबकि मैंने सरदारशहर (राजस्थान) में गांधी विद्या मन्दिर में बी० एड० विद्यार्थी के रूप में आपकी पुस्तक "शिक्षा" ("तालीमी खुतबात" के हिन्दी अनुवाद) को पढ़ना आरम्भ किया था। पहली जनवरी 1956 की वह कड़ाके की सर्दी की रात थी। रेगिस्तान के बीच स्थित छात्रावास के एक छोटे से कमरे में लालटेन के प्रकाश में मैंने, अपने सभी साथियों के सो जाने के बाद, लगभग दस बजे आपकी पुस्तक को पढ़ना आरम्भ किया था, और रात्रि के ढाई बजे तक उसे पूरी तरह से पढ़ कर ही सोया था। साढ़े चार घण्टे के उस शैक्षिक साहचर्य में ही आपने मुझे अत्यधिक मोहित किया था। इक्कीस वर्ष की आयु थी तब मेरी, आदर्शों की टकराहटों, आकांक्षाओं और स्वप्नों की आंख-मिचौली में खेलता हुआ मैं तब शिक्षक के व्यवसाय का प्रशिक्षण प्राप्त कर रहा था। आपकी उस पुस्तक की भाषा और सामग्री ने मुझमें विद्युत जैसी सनसनाहट उत्पन्न कर दी थी। "मदरसा किसी बड़े आलिम की ईजाद है…", "वह (बच्चा) सचमुच आपके आधीन है। न लाड़-प्यार की

में संकट-झेलने का मशवरा भी वे देते चलते हैं। वे पठन और अध्ययन के विषय में शिक्षकों से हमेशा मांग करते हैं। जब वे अलीगढ़ विश्वविद्यालय के कुलपति थे तो स्वभावतः और प्रभुता सेवा परंपरा के तहत कुछ प्रोफेसर उनसे मिलने आते और व्यर्थ की बातों में उनका बहुत समय बिगाड़ा करते थे। कुलपति डा० जाकिर हुसैन का शिक्षक-व्यक्तित्व जाग गया। वे उन प्रोफेसरों से अनुशासन और विषय की नई जानकारी और नई पुस्तकों की बात करने लगे। उनसे विनय करने लगे कि नया शोध-पर्चा तैयार कीजिए ताकि मुझे भी आप के विषय में कुछ मालूम हो। जाते समय वे उसे याद दिलाते थे कि भई, अब आप जब मिलने आए तो किसी नई किताब की समीक्षाओं का नया शोध-पर्चा लेकर आना। इससे चापलूस किस्म के बुद्धिजीवियों का आना जाना बंद हो गया।

डा० जाकिर हुसैन शिक्षक को राष्ट्रीय निर्माण का कर्णधार और राष्ट्र निर्माता मानते थे और कर्णधार तथा निर्माता के व्यक्तित्व को संभारने की अनेक युक्तियां भी सुझाते थे। लक्ष्य सधान की स्पष्टता, निष्ठा और सेवा भाव, कर्मठ अध्यवसाय और पठन-सस्कृति का स्वीकार ही शिक्षा का अलंकार है। वस्तुतः राष्ट्र निर्माता शिक्षक को अपने आप को गुणी और सक्षम बनाने के लिए बड़ी तैयारी की जरूरत है जो आज की आपाधापी और स्वार्थ सेवी जलन के कारण खतरे में हैं। हमें विश्वास है कि ये घड़ी भी बीतेगी। उत्तम समय आएगा। विघटन, आतंक और हिंसा के स्थान पर एकता, प्रेम और अहिंसा के फूल खिलेंगे। इस सौरभ समय मे हमे प्रेरणा देते डा० जाकिर हुसैन मिलेंगे।

है जो कक्षा और शिक्षार्थियों से कोई सरोकार नहीं रखता बल्कि प्रशासक-प्राचार्य मैनेजर, निदेशक आदि की हर संभव खिदमत करता है। डा० जाकिर हुसैन गुणात्मकता के इस प्रकार के उपकरणों और मानदण्डों के विरोधी थे। इसीलिए वे अक्सर कहा करते थे कि शिक्षाविदों को विचार और भावना के स्तर पर एक मत होकर शिक्षक की गुणात्मकता को सवारना चाहिए क्योंकि यदि शिक्षक विषम स्थिति में जीवनयापन करेगा तो वह शिक्षा का गुणात्मक विकास नहीं कर सकता। गुणात्मक विकास राष्ट्र-निर्माण की सर्वप्रथम आवश्यकता है।

शिक्षकों की भूमिका के विषय में डा० जाकिर हुसैन बहुत जागरूक और प्रेरणा-पथ प्रदर्शक थे। वे मानते थे कि समाज में बुराइयों ने घर कर लिया है। शिक्षा और शिक्षकों की स्थिति बहुत अच्छी नहीं है। अनेक समस्याएं हैं, समाधान कठिन है। संभावनाएं जटिल हैं और साधन सीमित है। वे प्रत्येक क्षेत्रकर्मी को स्मरण कराते थे। गुलामी के अंधकार भरे दिन बीत गए। यह भी बीत जाएंगे। आप निष्ठापूर्वक अपना कार्य करते रहो। वे विश्वासपूर्वक कहते थे कि समय के विषय में सबसे अच्छी बात यह है कि समय बीत जाता है। गुजरात विद्यापीठ अहमदाबाद में 18 अक्तूबर 1967 के दीक्षान्त भाषण में उन्होंने कहा था "समस्याओं से भरपूर भारत आपके सामने है। हमको इस भारत का नवनिर्माण करना है। अब हम गलतियों के लिए किसी दूसरे को दोषी नहीं ठहरा सकते। इस कार्य में विश्वविद्यालय के शिक्षक और शिक्षार्थी दोनों सुरक्षा-प्रहरी हैं। अब आप इस भूमिका को निभाने योग्य बनिए। इस जटिल कार्य के लिए अपने को तैयार कीजिए। गाँठ-बाँध लीजिए आत्मशिक्षा ही सर्वोत्तम शिक्षा है। वह शिक्षा जिसे आप स्वयं प्रदान करते हैं। आप घोड़े को तालाब तक ले जा सकते हैं लेकिन पानी नहीं पिलवा सकते। मैं सभी शिक्षकों और शिक्षार्थियों से आग्रह करता हूँ कि इस राष्ट्रीय कार्य को अपना निजी कार्य समझिए। इस कार्य-निष्पादन से मानसिक विकास होता है और हममे एक बेहतर इंसान का निर्माण होता है।"

डा० जाकिर हुसैन साहब व्यक्तित्व निर्माण की बात शिक्षकों के लिए कहते हैं। उनके अनुसार व्यक्तित्व-निर्माण में संस्कृति का योगदान महान होता है; इस लोक और परलोक की धारणाएँ, सामाजिक स्तर, कला, धर्म, रीति-रिवाज, नैतिक नियम, विधि-विधान, पारिवारिक जीवन, ग्राम-कस्बा, नगर जीवन, सरकार, कानून, कचहरी और स्कूल इस संस्कृति के पोषक तत्व हैं। वे इन तत्वों में से किसी एक की वकालत नहीं करते लेकिन इनसे प्रेरणा ग्रहण करने का संकेत देते हैं। उनकी मान्यता है कि उन महापुरुषों की जीवन-चरित्र प्रेरणा के पावन स्रोत होते हैं जो राष्ट्र-निर्माण मे अपना सर्वस्व न्यौछावर कर देते हैं। ज्ञान के विस्तार के अनेक साधन संभव है लेकिन महापुरुषों की जीवनी को अपना उपयोगी स्थान है। वे गांधी जी के जीवन, आदर्शों के पक्षधर थे और शिक्षकों के व्यावसायिक विकास में उनके विचारों के अध्ययन पर बल देते रहे हैं।

शिक्षक के ज्ञान और उसकी प्रतिभा का राष्ट्र से सरोकार जरूरी है। राष्ट्र हित

स्वतन्त्र विकास के लिए समर्पित रहता है। उन्ही के शब्दों में—"शिक्षक विद्यार्थियों पर अपना आदेश और सत्ता नहीं लादता। उसका कार्य तो उनकी सहायता करना, सेवा करना, और उन्हें समझना होता है। तदन्तर वह बालक को सम्मानपूर्वक विश्वास और प्रेम डालने की कोशिश करता है।" ऐसे काम करके ही शिक्षक सामाजिक परिवर्तन का लक्ष्य संधान करता हैं। इसी परिवर्तन को सवारने में वह समाज को नई दिशा देता है। यद्यपि इस समाज में वह हर ओर बहक और अटक चिन्ता का विषय है।

शिक्षको की आर्थिक समस्याओं से भी डा० जाकिर हुसैन पूर्णत: परिचित थे। वे भली-भाँति जानते थे कि आज का शिक्षक किन भौतिक अभावों में कार्य कर रहा है और जीवित है। उनका कहना था कि इस विषम स्थिति से उभरने के लिए कुछ प्रभावकारी कदम उठाए जा रहे हैं। वेतनों में सुधार हुआ है। सेवा-शर्तों में उपयोगी प्रावधान हुए हैं। लेकिन अभी बहुत कुछ होना बाकी है। शिक्षकों को राष्ट्रीय-पुरस्कार प्रदान करते समय 7 नवम्बर 1967 को उन्होंने अपने भाषण में कहा था—मैं तब तक प्रसन्नता व्यक्त नहीं कर सकता जब तक प्रारंभिक स्तर से सर्वोच्च स्तर तक की शिक्षा-सीढ़ी का प्रत्येक पायदान समान रूप से सम्मानित नही होता। यह सम्मान केवल शाब्दिक नहीं, अभिनंदनीय नहीं बल्कि उनके कार्य व भौतिक जीवन को सुखकर और सुविधाजनक बनाकर किया जा सकता है।

राष्ट्रीय विकास एवं निर्माण की दिशा में कोई भी सोच और समझवार सुझाव गुणात्मक उन्नयन का पक्षधर बनता है। गुणात्मक सुधार कार्य पद्धति में हो या चरित्र में; व्यक्तित्व मे हो या रचना-प्रक्रिया में; वह तभी संभव होता है जब सूझ-सराहना योग्य मिले। डा० जाकिर हुसैन की मान्यता थी कि शिक्षा के विभिन्न पहलुओं पर शिक्षाविदों के विचारों में मतभेद है। वे इन मतभेदों के रचनाधर्मी सरोकार की प्रशंसा करते थे। जामिया के शिक्षक समाज में विचार विमर्श के दौरान वे अपने विचारों का विरोध जमकर सुनते थे। कभी-कभार गरमाहट आ जाती थी वे जोश में अपनी बात प्रस्तुत करते थे। प्राय: इन विचार-विमर्शों का निष्कर्ष तभी नही निकाला जाता था। कई बार वे मत विरोधियों के सुझाव स्वीकार करते थे। उनके लीक-लेपी भक्त जब उनसे कहते कि आपने तो अमुक उस्ताद की बात को मान लिया। वह तो बड़ी बदतमीजी से आपकी बात को काटकर अपनी बात कह रहा था। इस तरह तो जामिया मे अनुशासन और आपका सम्मान नही रहेगा। ऐसे अवसरों पर वे हँस देते, कम बोलते थे यदि कोई भक्त अशांत हो उठता तो वे समझाते थे भई, आप बेकार नाराज हो रहे हैं। यह तो किसी बात पर बहस थी। उस बात पर उनकी बहस दमदार थी। उनकी बात मान ली गई। वे अपनी बात को सिद्दत से कह सकते हैं। इसमें मेरी और आपकी 'जात' कहाँ आती है। यह था शिक्षक की गुणात्मकता का सम्मान और आदर।

आज शिक्षक की गुणात्मकता का आधार जाति, धर्म और सम्प्रदाय हो गए हैं। इनके अतिरिक्त प्रशासन का प्रशंसक मात्र भी गुणी शिक्षक कहलाता है। यह वह शिक्षक

राष्ट्र-निर्माण में शिक्षकों की भूमिका : डा० जाकिर हुसैन के विचार

—डा० जयपालसिंह तरंग
प्रवक्ता—(स्पेशल एजूकेशन)

शिक्षा राष्ट्र-निर्माण का सुदृढ आधार माना जाता है। शिक्षा के केन्द्र को लेकर विचारकों ने बहुत मथन किया है और बालक अर्थात विद्यार्थी को शिक्षा का केन्द्र घोषित किया है। यह निर्विवाद सत्य है कि शिक्षा का केन्द्र-बिन्दु विद्यार्थी ही हो सकता है। अन्य उपकरण, शिक्षण-साधन, शिक्षण सामग्री, परीक्षण तथा शिक्षण प्राद्योगिकी कार्यक्रम का आधार-बिन्दु बालक या शिक्षार्थी ही है। इस सत्य के संदर्भ में एक विशेष महत्त्वपूर्ण तथ्य यह है कि प्रत्येक शिक्षाधर्मी कार्यक्रम की सफलता का प्रेरणादाता शिक्षक है। उसी के द्वारा शिक्षार्थियों मे शिक्षा की प्राण-प्रतिष्ठा होती है। राष्ट्र के नव-निर्माण एव विकास-कार्यक्रमों में शिक्षा के योगदान को सभी स्वीकार करते है। इसी स्वीकृति के अन्तर्गत राष्ट्र-निर्माण में शिक्षकों की भूमिका सुनिश्चित है। डा० जाकिर हुसैन स्वय एक शिक्षक थे। राष्ट्रपति पद पर आसीन होने पर उन्होंने शिक्षक को अलग खड़े होकर भी देखा। वे शिक्षक का बहुत मान-सम्मान करते थे। शिक्षकों की लगन, निष्ठा और समर्पित जीवन की वे खुलकर और खूब सराहना करते थे।

डा० जाकिर हुसैन के अनुसार शिक्षक सिद्धांत और व्यवहार का समन्वित सामाजिक कोष होता है। मनुष्य को कतिपय कोटियों में बाँटकर उसे सैद्धांतिक, कल्पनाशील, धार्मिक, आर्थिक, राजनैतिक और सामाजिक मनुष्य कहा जा सकता है। सैद्धांतिक मनुष्य का सर्वोच्च सिद्धांत सत्य होता है। धार्मिक व्यक्ति का लक्ष्य मोक्ष होता है। राजनीतिक व्यक्ति सत्ता से जुड़ा होता है। सामाजिक व्यक्ति के जीवन का आधार प्रेम होता है। डा० जाकिर हुसैन की मान्यता है कि इस प्रकार के व्यक्तियों की शुद्ध कोटि तो नहीं मिलती लेकिन किसी-न-किसी लक्ष्य का प्रबल प्रभाव जरूर परिलक्षित होता है। उन्होंने अच्छे शिक्षकों को सामाजिक व्यक्ति की कोटि में गिनाया है। उनके अनुसार उनके कार्य का सार इस बात में है कि वह मनसा-वाचा-कर्मणा प्रयत्नों से इन्हीं नवयुवकों में जीवन-मूल्य स्थापित करता है। वह प्रेम तथा सहानुभूति के साथ उनकी आवश्यकताओं और अपेक्षाओं को समझता है। उसका पूर्वाग्रह कली के समान अपरिपक्व किन्तु विकासवान व्यक्तित्व से रहता है। वह उस कली को सुसम्य सौरभयुक्त सुमन के रूप में मुकलित करने का प्रयत्न करता है। इससे उसे आत्मतुष्टि होती है। डा० जाकिर हुसैन शिक्षक को दरोगा का दर्जा नही देते। उनकी मान्यता है कि शिक्षक विद्यार्थियों के नैतिक एव स्वावलम्बी

डा० जाकिर हुसैन के विरुद्ध संयुक्त उम्मीदवार खड़ा किया। पर अंततः आप ही विजयी हुए।

इस प्रकार भारत ने स्वतंत्रता के बीसवे वर्ष में अल्पसंख्यक के एक सदस्य को अपना राष्ट्रपति निर्वाचित किया, जबकि संयुक्त राष्ट्र अमेरिका का पहला कैथोलिक राष्ट्रपति, उसका 34वाँ राष्ट्रपति था। जर्मनी के एक टेलीविजन संवाददाता ने डा० हुसैन से एक भेंट में इस बात पर अपना आश्चर्य व्यक्त किया कि भारत मे ऐसी बात संभव हो सकी है, जबकि यूरोप के लोग हिन्दू-मुसलमानों को एक-दूसरे का कट्टर दुश्मन समझते हैं, तो डा० हुसैन ने उस संवाददाता से कहा कि यह विचार बिल्कुल भ्रामक है। भारत एक धर्मनिरपेक्ष राष्ट्र है, जहाँ पर कोई भी व्यक्ति बिना धर्म आदि किसी भेदभाव के देश के सर्वोच्च पद पर पहुंच सकता है। सच तो यह है कि अल्पसंख्यकों के प्रतिनिधि भारत में महत्त्वपूर्ण स्थानों पर नियुक्त है। इस भेंट के दौरान डा० हुसैन ने इस भय को मिथ्या बतलाया कि भारत की एकता छिन्न-भिन्न हो जाएगी। निराशा का कोई कारण नही है। हमारे लोकतंत्र की जड़े मजबूत है और हमारी जनता परिपक्व है।

डा० जाकिर हुसैन इस दुनिया से चले गए, परन्तु यहाँ के लोगो के लिए वसीयत के रूप में छोड़ गए अपनी कार्य-क्षमता, सौजन्यता, विनम्रता एव विख्यात शिक्षा नीति। सच्चे जनतंत्रवादी एवं राजनेता के अतिरिक्त वे एक आदर्श गांधीवादी थे। हमे भूलना नही चाहिए कि बुनियादी शिक्षा को मूर्त रूप देने वाले डा० जाकिर हुसैन साहब ही थे। उन्होंने यह प्रत्यक्ष अनुभव किया था कि राजनीति को तग रास्ते से राष्ट्रीय पुर्नजागरण नही लाया जा सकता। यह शिक्षा, संस्कृति और राष्ट्रीय चरित्र के नए ढाँचे के माध्यम से ही लाया जा सकता है। उन्होंने अंग्रेजी शिक्षा पद्धति को पुराना और सारहीन समझा। उनका उद्देश्य था कि जामिआ मिल्लिया मे शिक्षा माध्यम को एक नए ढग से विकसित किया जाए ताकि इसकी जड़े राष्ट्रीय सस्कृति में जम सके। जामिआ मिल्लिया को उन्होंने एक ऐसी शैक्षिक संस्था का रूप दिया जहाँ शिक्षा एवं रहन-सहन के क्षेत्र में सामूहिक विकास प्रणाली को प्रारम्भ करने की चेष्टा के साथ-साथ छात्रो को नागरिकता की शिक्षा देने तथा कला के प्रति अभिरुचि जाग्रत करने का भी पूरा-पूरा अवसर प्रदान किया गया। भारत के भूतपूर्व राष्ट्रपति डा० राधाकृष्णन ने इनकी मृत्यु पर शोक प्रकट करते हुए उन्हें ख्यातिप्राप्त शिक्षाशास्त्री बताया श्री वी० वी० गिरि ने कहा था कि "राष्ट्रपति डा० जाकिर हुसैन सही अर्थ में अजातशत्रु थे। वे सभी को प्यार करते थे और किसी से घृणा नही करते थे।" वस्तुतः वे सच्चे मानवतावादी, विद्वान, महान शिक्षाविद् और श्रेष्ठ राजनीतिज्ञ थे। उनके विषय में जितना कहें कम है।

डा० जाकिर हुसैन : शिक्षक से राष्ट्रपति

—शेहला खान बी० एड०

डा० जाकिर हुसैन ने अपना जीवन जामिया मिल्लिया में एक शिक्षक के रूप में प्रारम्भ किया, परन्तु शनैः शनैः काल-क्रम में अपनी बुद्धि, योग्यता, लग्न, दक्षता, और चरित्र-बल के आधार पर वे भारत के तीसरे राष्ट्रपति बने। सन् 1948 ई० तक वे जामिआ मिल्लिया में कुलपति बने रहे। सन् 1948 में तत्कालीन शिक्षा-मंत्री मौलाना अब्दुल कलाम आजाद के आग्रह पर उन्होंने अलीगढ़ विश्वविद्यालय का कुलपति बनना स्वीकार किया। आठ वर्ष (1948-1956 ई०) तक आपने अलीगढ़ विश्वविद्यालय के उपकुलपति के रूप मे कार्य किया। आपने विश्वविद्यालय शिक्षा-आयोग में भी कार्य किया था, जिसकी स्थापना डा० एस० राधाकृष्णन् की अध्यक्षता में सन् 1948 ई० में हुई थी।

इसके अलावा वे प्रेस आयोग से भी संबद्ध रहे। सन् 1952 ई० से 1957 ई०, बिहार क राज्यपाल नियुक्त होने के समय वे राज्यसभा के सदस्य रहे राजनीति पद संभालने के बाद भी उन्होंने भारत और विदेशों में शिक्षा तथा संस्कृति के क्षेत्र में महत्त्वपूर्ण कार्य किए। उन्होंने अनेकों बार यूनेस्कों में भारत का प्रतिनिधित्व किया। 1956 ई० से 58 ई० तक वे उसके कार्यकारी मण्डल में भी रहे। शिक्षा और सस्कृति के क्षेत्र में उनकी सेवाओं के उपलक्ष्य में उन्हें 1954 ई० में 'पद्मविभूषण' और 1963 ई० में 'भारतरत्न' की उपाधि से अलंकृत किया गया था। 'जुलाई 1957 से 1962 तक बिहार राज्यपाल के रूप में ही रहे। पूर्ण निष्ठा एवं सच्चाईपूर्वक उन्होंने बिहारवासियों की सेवा की और विद्वान पुरुषों को सदैव आदर-सत्कार किया।

सन् 1962 ई० में उन्हें भारत के उप-राष्ट्रपति का पद प्राप्त हुआ। उपराष्ट्रपति राज्य सभा के पदेन अध्यक्ष होते हैं और इस हैसियत से भी इन्होंने दल के सभी वर्गों का आदर प्राप्त किया। नई दिल्ली आने वाले अनेक विदेशी राजनेताओं के साथ उनका घनिष्ठ संबध था। उन्होंने एशिया, अफ्रीका और अनेक पश्चिमी देशों का भी दौरा किया। भारत के इन देशों से मधुर संबध स्थापित हो सके।

चौथे आम चुनाव के बाद मई, 1967 ई० में जब राष्ट्रपति का निर्वाचन होने जा रहा था, तो देश की स्थिति अभूतपूर्व थी। 20 वर्षों तक लगभग सभी राज्यों पर एकछत्र शासन करने के बाद कांग्रेस को अनेक राज्यों में संसदीय चुनाव की पराजय का सामना करना पड़ा था। वैसे संसद में कांग्रेस दल का पूर्ण बहुमत तो था, किंतु 17 में से 8 राज्यों में दूसरे दल सरकार बनाने की स्थिति में थे। अतः स्वतंत्रता के बाद पहली बार राष्ट्रपति पद के लिए कड़ा मुकाबला होने की सम्भावना थी। लगभग सभी दलों ने कांग्रेस के उम्मीदवार

के रूप में छोड़ गए अपनी कार्य क्षमता, सौजन्यता, विनम्रता एवं विख्यात शिक्षा नीति। सच्चे जनतंत्रवादी एवं राजनेता के अतिरिक्त वे एक आदर्श गांधीवादी थे। हमें नहीं भूलना चाहिए कि बुनियादी शिक्षा को मूर्त रूप देने वाले डा० जाकिर हुसैन ही थे। भारत के भूतपूर्व राष्ट्रपति डा० राधाकृष्णन् ने इनकी मृत्यु पर शोक प्रकट करते हुए कहा— "डा० जाकिर हुसैन के अचानक निधन से मुझे गहरी संवेदना और दुःख हुआ है। वे महान, भद्र, ख्याति प्राप्त शिक्षा शास्त्री तथा स्वनिर्मित व्यक्ति थे।"

3 मई, 1969 को स्थानापन्न राष्ट्रपति श्री वी० वी० गिरि ने कहा था कि— "राष्ट्रपति डा० जाकिर हुसैन सही अर्थ में अजातशत्रु थे। वे सभी को प्यार करते थे और किसी से घृणा नहीं करते थे।" बिहार के तत्कालिक राज्यपाल श्री नित्यानद कानूनगो ने आपको साम्प्रदायिक सद्‌भावना का प्रतीक, एक कुशल राजनीतिज्ञ, शिक्षाविद् तथा सच्चा जनसेवक बतलाया था। वस्तुत: वे सच्चे मानवतावादी, विद्वान, महान् शिक्षाविद् तथा श्रेष्ठ राजनीतिज्ञ थे। वे हम लोगों के लिए सदैव प्रेरणा स्रोत बने रहेंगे।

आठ वर्ष (सन् 1956 ई०) तक आपने अलीगढ़ विश्वविद्यालय के कुलपति के रूप में कार्य किया। आपने विश्वविद्यालय शिक्षा आयोग में भी कार्य किया था, जिसकी स्थापना डा० एस० राधाकृष्णन की अध्यक्षता में सन् 1948 ई० में की गई थी। इसके अलावा वे प्रेस आयोग से भी संबद्ध रहे। सन् 1952 ई० से 1957 ई०, बिहार के राज्यपाल नियुक्त होने के समय वे राज्यसभा के सदस्य थे। राजनीतिक पद संभालने के बाद भी उन्होंने भारत और विदेशो में शिक्षा तथा संस्कृति के क्षेत्र में महत्वपूर्ण कार्य किए। उन्होंने अनेकों बार यूनेस्कों में भारत का प्रतिनिधित्व किया और 1956 ई० से 58 ई० तक आप उसके कार्यकारी मंडल में भी रहे। शिक्षा और संस्कृति के क्षेत्र मे उनकी सेवाओं के उपलक्ष्य में उन्हें 1954 ई० में **'पद्मविभूषण'** और 1963 ई० में **'भारतरत्न'** की उपाधि से अलंकृत किया गया। 5 जुलाई, 1957 में भारत के राज्यपाल के रूप में डा० जाकिर हुसैन बिहार आए और सन् 1962 ई० तक राज्यपाल के रूप में ही रहे।

सन् 1962 ई० में उन्हें भारत का उप-राष्ट्रपति का पद प्राप्त हुआ। उपराष्ट्रति राज्य सभा का पदेन अध्यक्ष होना है और इस हैसियत से भी इन्होने दल के सभी वर्गों का आदर प्राप्त किया था। नई दिल्ली जाने वाले अनेक विदेशी नेताओं के साथ उनका घनिष्ठ सबंध था। चौथे आम चुनाव के बाद मई, 1967 ई० में जब राष्ट्रपति का निर्वाचन होने जा रहा था, तो देश की स्थिति अभूतपूर्व थी। 20 वर्षों तक लगभग सभी राज्यों पर एकछत्र शासन करने के बाद कांग्रेस को अनेक राज्यों में संसदीय चुनाव का पराजय का सामना करना पड़ा था। जैसे ससद में कांग्रेस दल का पूर्व बहुमत तो था, किंतु 17 में से 8 राज्यों में दूसरे दल सरकार बनाने की स्थिति में थे। अतः स्वतंत्रता के बाद पहली बार राष्ट्रपति पद के लिए कड़ा मुकाबला होने की संभावना थी। लगभग सभी दलों ने कांग्रेस के उम्मीद-वार डा० जाकिर हुसैन के विरुद्ध एक सयुक्त उम्मीदवार खड़ा किया। पर अततः आप ही चुने गए।

इस प्रकार भारत ने स्वतंत्रता के बीसवें वर्ष में अल्पसख्यक वर्ग के एक सदस्य को अपना राष्ट्रपति निर्वाचित किया। जब जर्मनी के एक टेलिविजन संवादाता ने डा० हुसैन से एक भेंट में इस बात पर अपना आश्चर्य व्यक्त किया कि भारत में ऐसी बात सभव हो सकी है, जबकि यूरोप के लोग हिंदु-मुसलमानो को एक-दूसरे का कट्टर दुश्मन समझते हैं, तो डा० हुसैन ने कहा कि यह विचार बिल्कुल भ्रामक है। भारत एक धर्मनिरपेक्ष राष्ट्र है, जहां पर कोई भी व्यक्ति धर्म आदि सबंधी बिना किसी भेदभाव के देश के सर्वोच्च पद पर पहुंच सकता है।

यह हमारा दुर्भाग्य था कि 3 मई, 1969 को इस महान व्यक्ति का राष्ट्रपति भवन में देहावसान हो गया।

प्रभाव

डा० जाकिर हुसैन इस दुनिया से चले गए, परंतु यहां के लोगों के लिए वसीयत

सम्मान दिया है, जिसने आज से सैंतालिस वर्ष पहले अपने जीवन के सर्वश्रेष्ठ भाग को राष्ट्रीय शिक्षा के लिए अर्पित करने का निश्चय किया था।"

सन् 1924 ई० में जब डा० जाकिर हुसैन विद्याध्ययन करने जर्मनी गए थे, उस समय वहीं उन्हें इसकी जानकारी करायी गई कि जामिया मिल्लिया को चलाने वाले लोग धन की कमी के कारण इस संस्था को बंद कर देना चाहते हैं। इस समाचार से उन्हें बहुत दुःख हुआ और टेलीग्राम द्वारा शीघ्र ही उन्होंने सूचित किया, 'मैंने और यूरोप में मेरे कुछ साथियों ने जामिया मिल्लिया को अपना जीवन अर्पित करने का फैसला किया है। जब तक हम भारत नहीं आ जाते, तब तक इस संस्था को बंद नहीं किया जाना चाहिए।" फल-स्वरूप इस संस्था को बंद करने की बात रोकी गई। सन् 1925 ई० में महात्मा गांधी की सलाह से जामिया मिल्लिया का अलीगढ़ से दिल्ली स्थानांतरण किया गया। सन् 1926 ई० में डा० जाकिर हुसैन स्वदेश लौटे और उन्हें जामिया मिल्लिया के कुलपति का पद दिया गया। केवल उन्तीस वर्ष की आयु में कुलपति का पद प्राप्त करना—तथ्य से प्रकट होता है कि डा० साहब जनता के प्रिय पात्र तो बन ही चुके थे, उनके चरित्र और व्यक्तित्व के प्रति सबका विश्वास भी जम चुका था। इनके सफल प्रयासों के फलस्वरूप यह संस्था भारत में ही बल्कि जगत में विख्यात हो गई।

डा० जाकिर हुसैन और उनके मित्रों ने जिनमें बहुत से बर्लिन, आक्सफोर्ड और कैंब्रिज के स्नातक थे, ब्रिटिश शासन काल के दौरान में, कभी भी सौ रुपये से अधिक वेतन नहीं लिया। जामिया मिल्लिया इस्लामिया की इमारतों, बागीचों और बागवानियों के सौंदर्य में डा० जाकिर हुसैन की छाप स्पष्ट परिलक्षित होती है।

रचनाएं

डा० जाकिर हुसैन अपने अवकाश का उपयोग लेखन-कार्य में करते थे। बच्चों के लिए लिखना वे सबसे अधिक पसंद करते थे। उन्होंने हृदय नाम से बच्चों के लिए अनेक कहानियां लिखीं। उनकी प्रमुख रचनाओं में 'तालिमी खुतबात' (शिक्षा) 'एजुकेशन रिकॉन्सट्रक्शन इन इंडिया' (भारत में शिक्षा का पुनर्निर्माण), प्लेटो की पुस्तक 'रिपब्लिक' का उर्दू अनुवाद उल्लेखनीय है। इसके अलावा उन्होंने एडविन कवेंस की पुस्तक 'एलीमेंटस ऑफ इकोनोमिक्स' तथा आर्थिक विषयों की अन्य पुस्तकों का भी अनुवाद किया।

शिक्षक से राष्ट्रपति

डा० जाकिर हुसैन ने अपना जीवन जामिया मिल्लिया में एक शिक्षक के रूप में प्रारंभ किया, परंतु शनैः शनैः काल-क्रम में अपनी बुद्धि, योग्यता, लगन, दक्षता और चरित्र बल के आधार पर वे भारत के तीसरे राष्ट्रपति बनें। सन् 1948 ई० तक वे जामिया मिल्लिया में कुलपति बने रहे। 1948 ई० में तत्कालीन शिक्षा-मंत्री मौलाना अब्दुल कलाम आजाद के आग्रह पर उन्होंने अलीगढ़ विश्वविद्यालय का कुलपति बनना स्वीकार किया।

"डा० जाकिर हुसैन"

–मधुबाला बी० एड०

जीवन परिचय

डा० जाकिर हुसैन का जन्म 8 फरवरी, 1897 ई० को हैदराबाद में हुआ था। इनके पिता हैदराबाद में ही वकालत करते थे तथा 'आइना-ए-डकन' नामक कानून संबंधी पत्रिका के सपादक भी थे। इन्होंने जाकिर हुसैन की शिक्षा का प्रबंध एक अंग्रेज शिक्षक के निर्देशन में घर पर ही किया था। दुर्भाग्यवश वकील साहब का देहान्त उस समय हो गया, जब जाकिर साहब मात्र नौ वर्ष के ही थे।

छात्र जीवन

पिता की मृत्यु के पश्चात् इनका परिवार उत्तर प्रदेश मे फरुखाबाद जिले के कायमगंज नामक स्थान में आ गया। आप अपने तीन भाइयों के साथ एक हाई स्कूल में दाखिल हुए। बी० ए० की डिग्री आपने डाक्टर हुसैन मोहम्मद ऐंग्लो ओरियंटल कालेज (वर्तमान अलीगढ़ विश्वविद्यालय) से ली। एम० ए० में आपने अपना नाम दर्ज कराया था, परन्तु 1920 में महात्मा गांधी के आह्वान पर 'असहयोग आंदोलन' में शामिल हो गए और भारतीय स्वतंत्रता में अपनी जबरदस्त भूमिका निभाई। इस समय उनकी अवस्था मात्र तेईस वर्ष की थी। कुछ वर्ष पश्चात् आपने जर्मनी में बर्लिन विश्वविद्यालय से अर्थशास्त्र में पीएच० डी० की उपाधि प्राप्त की। इनका विवाह 18 वर्ष की किशोरावस्था में ही शाहजहाँ बेगम के साथ हुआ था। उस समय आप विद्यार्थी थे।

जामिया मिल्लिया इस्लामिया की स्थापना

12 अक्तूबर, 1920 ई० को तेईस वर्ष की युवावस्था में महात्मा गांधी के आह्वान पर अहसयोग आन्दोलन में भाग लेकर जहाँ एक ओर डा० जाकिर हुसैन ने देश सेवा हितार्थ अपने को उत्सर्ग करने तथा मातृभूमि के प्रति अपने प्रेम को दर्शाया, वहीं दूसरी ओर, कालेज छोड़ते ही आपने अलीगढ़ में एक राष्ट्रीय शिक्षा सस्था 'जामिया मिल्लिया इस्लामिया की स्थापना कर इसका भी जबरदस्त परिचय दिया कि आप एक प्रबुद्ध सफल शिक्षक हैं। आप में पूरी संगठन शक्ति है। डा० जाकिर हुसैन उन थोड़े से देशभक्त भारतीयों में थे, जिन्होंने अपना जीवन शिक्षा-क्षेत्र में लगाकर राष्ट्र की सेवा की। सन् 1967 ई० में जब वे भारत के राष्ट्रपति चुने गए, तो 1920 ई० के गुजरे जमाने का स्मरण करते हुए उन्होंने कहा था, "वास्तव में राष्ट्र ने एक साधारण अध्यापक को इतना बड़ा

WORK

"Work that is educative has normally four steps of objectification : (1) the clear description of the problem, what it is exactly that is sought to be done, (2) the formation of a plan of doing it by thinking out the appropriate means and steps of doing it, (3) the actual execution of the work, and (4) criticism of the work done in the light of the objectives."

WORLD PEACE

"World peace today depends largely upon the marriage of religion and science. Religion should be enabled to find the means by which world society can move forward towards a united, prosperous, happy and peaceful world community."

YOUTH

"Remember that youth is not an attainment, it is an opportunity. Do not let that opportunity slip by."

SPIRITUALITY

"I maintain that the concern of education, and therefore of the university, is with the individual and the spiritual, and the university cannot do too much to refuse to deviate from its responsibility in this regard."

UNIVERSITY

"From a place of transmission of information the university should make itself a place of productive intellectual work, generating habits of systematic, methodical thinking, readiness for self-examination and self-criticism, and allegiance to absolute values, making clear the way for the development of a free moral personality. For a free moral personality, is, in my view, the proud product of a sound education."

"Hurdled in the terrific torrent of routine, the universities (in India) have no time to think."

UNIVERSITY

"The days when universities lived in an ivory tower existence, far from the madding crowd, are gone forever. Universities have now to be at the very centre of the national struggle for development...... As an objective, competent and fearless organization, they must also evaluate the progress of national development from time to time and help the nation to avoid waste and to improve its plans What is even more important they should evolve programmes of national service which would enable teachers and students to participate in challenging and worthwhile programmes of community or national service with a view to inculcating, in the rising generation, a love of the motherland, a commitment to national development and a sense of social responsibility."

\+ + + +

"A university is to be regarded primarily as a community of scholars and students who should be treated as responsible members of a free academic society free to think, free to express their thoughts, free to refuse to conform, free to be orthodox, free even to err...... It is only in such freedom that one develops that invaluable quality, moral change, to speak out freely, frankly and fearlessly when the moral good of the society is involved......Universities are houses of ideas; enquiry and challenge are their functions; to establish patterns is almost their business in a progressive society."

UNIVERSITY

"One plants rice or wheat when one looks forward for a year. One plants a tree when one looks forward to a life time. But universities are planted for eternity."

"A University is a powerful instrument, not only for the all-sided development of one's nation, but for the progress of mankind as a whole."

"A well-developed system of counselling is, in my view, our essential part of a good university."

TEACHER

"It is the educator's business to ask whether his pupil has also been helped to become honest and truthful, socially cooperative and helpful if he can see any beauty in art and nature, if he can ever pursuade himself to subordinate his selfish ends to the good of the whole of which he is part...... He (educator) should seek to reshape the totality of his being...... his hand, has mind and his heart."

+ + + +

"Education is one of the vocations and if you have the feeling that it is a mission that you have to perform, it is something without which you would not be satisfied, then you are entitled to be an educator and a teacher."

+ + + +

" .....the teacher's function is to help the growing child in his hand to become what he is capable of becoming, not what the teacher thinks be should be."

TEACHER

"The frontispiece of the (good) teacher's book of life does not bear the legend *knowledge* but *love*."

\+ + + +

"The growth of the morally autonomous personality is the aim and end of his endeavour."

\+ + + +

"The teacher's is not to dictate or dominate. his is to help and to serve, to understand and shape in Faith, Love and Reverence—Yes, Reverence for the child."

SELF-EDUCATION

"........you have to bear in mind that education can best be self-imparted. You can lead a horse to a pond, but you cannot make it drink."

SERVICE

"We can serve Him only by serving our people, our neighbour, our fellowmen."

SPECIAL EDUCATION

"It is good that those mentally retarted children who have the ability should learn to read and write. But not all of them will, and reading and writing is not the only form of education They will also learn skills of hand and eye that will give them satisfaction in a job well done.

SECULARISM

"We are secular because that is the only sane policy that we can have in a multi-religious society. Secularism does not mean irreligion but equal respect for all religious."

\+ + + +

"Our own country presents a novel example of unity in diversity' and our efforts have been, from time immemorable, directed towards preserving this distinctive quality. The great, and by no means easy, experiment of establishing a secular democracy in which we are engaged, bears testimony to this. If we in this land, speaking different languages and representing different cultures learn to live in harmony and peace, we will, in our own way, be able to set a good example to others of understanding and reconciliation."

SELF

"Be yourself—think for your-self. Judge things for yours. Feel responsible and own responsibility for your actions. If you must look for faults, look for them not in others but in yourself. We all have enough of our own to set right. The good is a discovery of the individual."

PUBLIC SCHOOLS

"........., let those schools (Public Schools) that exist continue to florish and set the model for others, and let society provide for its poor but talented boys to avail of their services. It is a bad thought that no one should be permitted to have good education because all can not have it This appears to me to be childish—with due apologies to the child".

RELIGION

"Religion is a spiritual experience. Those who are authentically religious undergo an inner transformation and they radiate peace, harmony and good will."

\+ + + +

"........the religious spirit is the foundation-head of the aspiration of man to serve his fellowmen, to establish equality and justice, to abolish ignorance, pain and sorrow".

NON VIOLENCE

"Whether or not non-violence is accepted as a religious creed, it has to be accepted by all as a postulate for civilized behaviour and expression of respect for human personality."

"If the people of India eschew non-violence there is no hope for them. Non-violence, which Gandhiji preached, was not only a metaphysical doctrine and a religious truth to him, but it was also an act of statesmanship."

PATIENCE

".........I have a firm conviction that no good cause has suffered unduly or for too long because of lack of resources. It seems to be a quality of the wisdom of Providence not to fulfil needs as they arise, to try the patience of us human beings but complete deprivation is also not something that appeals to Providence."

MUSIC

"Music unites and does not divide men for it knows no barriers of caste, creed, religion or language. So the musicians can also play a useful part in the promotion of national unity which is the crying need of the humanity."

NATIONAL INTEGRATION

"I have no manner of doubt in my mind that there can be no national integration unless we succeed in making of our national state demonstrably a moral entity; unless by a great and persistent educational effort we implant in the people the conviction of its moral basis."

NATIONAL DEVELOPMENT

"...........the breakthrough in our education reconstruction in the first instance, and ultimately in national development itself can come only if we can so reconstruct our higher education that it sends out bands of youngmen and women who are competent, disciplined, and dedicated to the service of the masses and the development of the country."

INDIAN STATE

(Our) State is the expression of our collective strength, the condition of our ordered and peaceful existence, the symbol of our cooperative endeavour, the embodiment of justice and morality, the promoter of our excellence, the custodian of all that is good in our past, and the guarantor of our future destiny.

LANGUAGES

Languages are tender plants and they have to be nurtured with tender care and refresing devotion. Nothing harms a language more than the so called language chauvinism and exclusiveness, for the basic foundation of language is to join and not to separate ..... There is an underlying unity in the rich diversity of languages in our country.

LOVE

You know rain is God's grace, and when it rains it does not see whose field is this, whether the owner is a Hindu or a Muslim, whose garden is this, whether it is of a Brahmin or of a Harijan, it rains equally all over and it waters all fields. In the same way, love does not make any difference, be he a Muslim, Brahmin or Harijan. With good and real education we can instil this spirit in children's hearts.

EDUCATION

"The justification of good education is an enrichment of life for individual human beings and the full development of their spiritual potentialities."

FREEDOM

"Freedom is never given. it is earned, and kept only by those who continue to earn it every minute of their active life."

It is true that we have won our freedom, but there are two aspects of freedom—there is freedom **from** something and there is freedom **for** something The freedom from something we have achieved; but we are not quite sure what that freedom is **for**. We, I mean, our people, seem to go this way and that way and their commitment to non-violence and discipline is not as express and as obvious as one would have wished.

EDUCATION

"The education of a mind is essentially a process of revitying in it the latent values contained in cultural goods".

+ + + +

.........*a cultured human being is the end of education effort*... . ... Therefore, apply your mind to understanding the personality of the students and apply your mind to the structure of the cultural goods which are the instrument of education and try to find out the correspondence between the two and bring them together."

+ + + +

Education is the individualized subjective revivification of objective culture. It is the transformation of the objective into the subjective mind. It is an individually organised sense of values awarded by goods of culture which are embodiments of the values accessible in experience to the person concerned.

DEMOCRACY

The challange of this century is to advance from the democratic state to the democratic world, i.e. a Free World Federation.

DUTY

Duty is not dumb obedience, it is an active desire to fulfil obligations and responsibilities. The performance of duty is not dependent upon or subject to the grant of rights. The dignity of the democratic citizen consists not in possessing rights that will counter-balance his duties, but in his regarding the performance of his duties as the right and privilege.

GOD

"We can serve Him only by serving our people, our neighbour, our fellow-men."

ART

Art should not only mirror contemporary life but should function as an instrument of social change. There could be no better instrument than the medium of music, dance and drama to bring about national integration. These art forms, by their very nature, bring together people and promote understanding.

BOOK

The book is a wonderful companion. It is a wonderful companion for those who are lonely, it is a wonderful teacher for those who wish to learn and it is a wonderful source of enjoyment.

DISCIPLINE

"Democracy portulates a self-imposed discipline. Democracy allows full freedom of discussion. Once after discussion a consensus is reached or a majority decision taken, it has to be honestly and cheerfully implemented. Everyone of us partaking in the democratic process should constantly put himself the question if he is imposing this democratic discipline on himself, for only so democracy can be made workable".

Dr. Zakir Husain on "Education & Human Views"

Compiled by : PROF. S.P. RUHELA

CHANGE

...nothing is more desiable than change if it is conceived as a process of evolution; it may be worth considering if it is regarded as an experiment; as an end it itself it can appeal only to the thoughtless.

..."We must be alive to our problems and our needs, and we must meet the new situations not with the mental equipment that was old and early fifty years ago, but with the new weapons progress has forged".

CULTURAL SYNTHESIS

...something deep down in me seems to furnish me with the belief that Providence has destined India to be the laboratory in which the greatest experiment of cultural synthesis will be undertaken and sucessfully completed. India's mission in the world history seems to one to be the evolution of a distinct type of humanity combining and harmonising in itself the writes of the diverse types which history has produced, all blended together to form a new type that might evolve a characteristic and, perhaps, more satisfactory pattern of civilized existence than those in vogue at present.

He was always striving to reach out to broader, higher and nobler national and universal frontiers. To him religion was a means to a good life.

As an educationist, Dr. Zakir Husain was a romantist, an idealist. He had an amazing personality which he had built brick by brick, morter by morter, with strong will, in poverty, with high sense of values and great commitment to nobler aspects of human life. He was an aristrocrat in his spirit of mind. He had a balanced inteigrated personality with a very high degree of moral integrity. His contributions to Indian society—its political economy, its education and its culture shall always remain as great sources of inspiration and guidance to all of us.

Dr. Zakir Husain's Educational Contributions

A SYMPOSIUM

The educational contributions of Dr. Zakir Husain in the context of the emerging Indian Society were highlighted in a symposium organised by the Department of Teacher Training & Non-Formal Education, Jamia Millia Islamia on the occasion of the 90th Birth anniversary of Dr Zakir Husain, on Feb. 3, 1987.

Prof. S P. Ruhela, Head of the Department of Teacher Training in the Jamia, while highlighting the experiment of building the Jamia undertaken by Dr. Zakir Husain, underlined the fact that Jamia during the 66 years of its existance has by providing low cost and dynamic education to about a million first generation learners of the families of lower and middle classess of Muslims, Hindus and other communities, helped them to achieve social mobility, modernization, enlightenment and emancipation in their lives.

Prof. R.P. Singh, N.C.E.R.T., held that Dr. Zakir Husain was essentially a humanist, a truly cultured, secular and moral person having a deep commitment to develop a useful and value-oriented education for the masses of the country.

Prof. Aqil, Life member of the Jamia and a contemporary of Dr. Zakir Husain, reminded the scholars that the contributions of Dr. Zakir Husain to Indian economics were remarkable. He was influenced by the 'System of Understanding' theory of German teacher economist Prof. Bernard Zombart. He tried to analyse Indian economic problems in that perspective and advocated mixed economy.

In his presidential remarks, eminent political scientist Prof. Raisuddin Khan of the Jawahar Lal Nehru University, said that the contributions of Dr. Zakir Husain can best be valuated in three ways—his role in building the nation, his role as an experimenter of educational structures, and his role in building up his own charming and inspiring personality. Dr. Zakir Husain's dream was not merely of building the Jamia, but it was that of building a unified composite culture in India.

A Tribute to Dr. Zakir Husain

ALKA RANI, B.Ed. (Section 'C')

By the cruel hands of Destiny
You were snatched away from us.
But you still live......
In our memory,
In the soft thread of your views
            Woven in the fabric of education,
In the light of your personality
            shining in printed words.
But the light must transcend
The dull sphere of printed words
And spread over
Our lives, our thoughts, our conscience.
For we are all fumbling
In the confused gloom of
            words, words, words......
And slowly getting lost in the hollow of
            talks, talks and talks
Lead us, for we all surmise
We too have lights within our souls
            As you had.
And we too can bloom into perfection
            As you did.
But lead us, for
We are still fumbling in darkness.

Dr. Zakir took out a guava from his pocket and said to Mr. Kalam,

"This is the first guava of my guava tree.

It is for you........" and then Dr. Zakir continued with his other engagements.

5. DR. ZAKIR—THE WORKER :

Dr. Zakir Husain did not know magic, yet he had the ability to create a magical effect. When Jamia was being built, Dr. Zakir was the Vice-Chancellor and he was also the private secretary to the Vice-Chancellor. He was his own clerk. He kept the accounts, supervised the constructions & worked as treasurer too. He collected money for the construction. In addition to all these, he taught in both lower & higher classes.

Dr. Zakir Husain was appointed in Jamia on a salary of Rs. 300/- per month often he returned form Germany. As Jamia progressed the salary of Dr. Zakir was reduced. From 300/- p.m. it came down to Rs 150/- p.m. and at one time it was reduced to a mere Rs. 75/- p.m. And the element of greatness is this that he himself proposed the reduction of his salary in the management committee and the members accepted the proposal with a heavy heart.

6. DR. ZAKIR—THE HUMAN BEING :

Dr. Zakir Husain was a true human being. He knew how to respect others and how to get respect from others. The following incident highlights this aspect of Dr. Zakir Husain's personality.

There was one Munshi Ali Mohammad in Jamia primary school. He was a religious man, wearing religious dress, regular in Roza and Namaaz. He considered it a crime to wear a long Pyjama, but he worked really hard to teach the primary students. Whenever Dr. Zakir happened to pass in front of Munshiji's class, he used to pull his pyjama up, and later he lowered it. Someone asked Dr. Zakir why he did like that, Dr. Zakir replied, "Munshiji has a firm belief that anyone with a long pyjama will go to hell. He loves me and he would not like my going to hell. He will feel bad at seeing my long pyjama and so in order not to hurt him I raise my pyjama."

. DR. ZAKIR—THE CARETAKER :

When Dr. Zakir felt the Governership of Bihar, one of his body-guards said, "we haven't seen any governer as great as Dr. Zakir. While we were with him, it seemed as if we were the Governer & Dr. Zakir, our body-gaurd."

If Dr Zakir went to attend any party, he saw in advance the food arrangements for the men who accompanied him.

On Feb. 8' 1965—his birthday—early in the morning he went to enquire about the health of his sick driver.

On receiving the invitation of the marriage of the daughter of his old peon, he went there without informing in advance and kept searching the house of the peon on foot.

On coming to know about the death of one of his friends, he presented himself for *Namaaz of Janaaza at 12 at night inspite of it being* bitter cold and he being sick.

4. DR. ZAKIR—THE BOSS

This incident occured at the time when the Jamia was celebrating its Silver Jubilee. In that function many renowned leaders of the country including Mr. Jinnah and Pandit Nehru were supposed to come. The red sand was to be spread over a road and the workers had refused to work after an argument with the contractor. The next morning guests were to come. Now how to spread the sand ? Dr. Zakir handed over this task to one of his close ones, Mr. Kalam, Dr. Zakir came to see the progress of the work at eleven P.M. The work had not started. He went to Mr. Kalam. Mr. Kalam requsted Dr. Zakir to go do bed and have a nine sleep assuring that the road would be ready by morning.

Dr. Zakir went back. The spreading of red sand begun at 12 at night by students and teachers of Teacher Training College including Mr. Kalam. Dr. Zakir again came to see the progress of the work at 2 A.M. and seeing that work was going on smoothly, went back.

Next day Dr. Zakir had a busy schedule but he look some time apart, went to Mr. Kalam, and said :

"I have brought something for you, Kalam"

"Give it, then" Mr. Kalam said.

Dr. Zakir Husain : Viewed From Six Angles

SANTOSH KUMAR, B.Ed., 1986-87

1. DR. ZAKIR—THE STUDENT :

Zakir Husain had passed his high school examination which flying colours from the Muslim High School, Itawa. When Zakir was about to leave the school, the Headmaster of the school Mr. Altaf Husain thought of testing Zakir, Mr. Altaf had his own way of testing a student. So, Mr. Altaf invited Zakir to dinner at his place. The dinner was served in due time. When Zakir had gone out of the room for washing hands, the Headmaster took soup out of Zakir's plate and poured water into it. Zakir came back and started eating without noticing the change in the food. Zakir praised the food. Then the Headmaster laughed, patted Zakir on back, praised him and said, "Dear son, you have control over the greed of the tongue. so, you will surely rise high in life." And then Zakir was told about the replacement of soup by water. Hearing this, Zakir himself was very surprised.

2. DR. ZAKIR—THE FRIEND :

Dr. Zakir Husain used to indulge in long discussions with freinds and colleagues in which he himself got excited and made others excited as well. Once when Dr. Zakir was the Vice-Chancellor of Jamia Millia Islamia he got indulged in an argument with the then Principal of Jamia Teacher Training College Mr. Sayeed Ansari regarding the result of a student. Dr. Zakir wanted the student to pass whereas the Principal was opposed to it. The discussions continued for quite long, and it had to be stopped late at night without any result. The then Registrar of Jamia was a silent observer of all these. Next morning Dr. Zakir met the Registrar and requested him to call Mr. Sayeed, Dr. Zakir felt so sorry about the discussions of last night that he was not even able to eat. When Mr. Sayeed Ansari came with the Registrar, he (Mr. Sayeed) opined that Dr. Zakir was right and that he himself was extremely sorry about the matter. And new the situation was that Dr. Zakir was advocating Mr. Sayeed's viewpoint and Mr. Sayeed was advocating Dr. Zakir's viewpoint regarding the result of the student. At last, the Registrar intervened and the matter was decided.

mended to include work experience at different levels of school education. But work experience in itself was too mild a version of the kind of work Dr. Zakir Husain had been advocating to the educationists of the country. It was for this reason that the Ishwar Bhai Patel Committee on the Review of Ten-Year School Curriculum—1977 disagreed with the idea of work-experience and criticised its proposition on the ground that an important component of the "social usefulness" was totally missing from it. In place of work experience therefore, it, suggested the inculcation of 'Socially Useful' Productive Work (SUPW) which in the opinion of the Committee was more appropriate to the demand of work based education. The programme of Action for the National Policy of Education 1986 has also taken note of the need and significance of work as a medium of education and has stressed on the commitment of the youth to manual work in the National System of Education.

preparing the entire scheme and the syllabi for Basic Education. In the report of this Committee Dr Zakir Husain again stressed that the most effective approach to the problem of providing an integral all-sided education was non else than the use of some suitable form of productive work for educating the children. He pleaded that our education reconstruction should be guided by two fundamental principles : (1) the principle of work: and (2) the principle of social orientation.

In the All India Education Conference in 1940 while talking on the meaning of work in education he clarified : "Let those who wish to make work the medium of education remember that work is not purposeless, that it is not content with any result that may follow. Work does not mean the passing of time by doing haphazard thing. it is not amusement; it is not play, it is work, it is purposeful striving."

The purposeful striving alone can train the learner in the art of living which is and should be the foremost aim of education in any society. It is the purposeful work at school that would commensurate the real life problems and experiences of the child and thus would help him in becoming a more fulfilling person for himself and for the community. In the Sardar Patel Memorial lectures in 1958 while discussing the compulsory public education system he emphasised that the first thing that such a system should aim at will be to educate the citizen for some useful work. This only. in his opinion, will prepare him for a definite function in the society.

Although the National Basic Education scheme developed by the Zakir Husain Committee which incorporated work as the centre of entire educational activity was highly appreciated and widely welcomed by several teacher organisation, educationists and others, very little of it could see the light of the day in its right perspective and as a result the idea of work based education also could not sufficiently be translated into practice. Dr. Zakir Husain was unhappy over this state of affairs which he expressed while delivering the convocation address of the Sri Rama Krishna Mission Vidya Rural Institute, Coimbatore in the year 1961 in these words : "The idea of work as the instrument of education has been under discussion in our country for sometime and I cannot resist the disturbing conclusion that, by and large, its significance and its possibilities have been missed."

In its report the Education Commission 1964-66, perhaps in recognition of Dr. Zakir Husain's notion of useful productive work, recom-

Dr. Zakir Husain and Education Through Work

M. AKHTAR SIDDIQUI
Lecturer in Education,
Deptt. of Teacher Training & Non-Formal Education, Jamia

An excellent teacher with several inborn qualities of a conscientious and affectionate chalk-face practitioner and of a creative and enterprising educationst. This was, perhaps, the most glaring aspect of the many splendoured personality of Dr. Zakir Husain. It would not be wrong to say that across the country he was known more for his pragmatic educational thought and innovative educational endeavour than for anything else.

As an educationist he firmly believed that education, in order to have any meaning for the individual and for the community, should necessarily be imparted through the vehicle of work and through providing a feel of real social life to the educands while they are at school. In October 1937 when he was invited to attend the first national conference on Basic Education at Wardha, expressing his deep dissatisfaction with the then prevalent and popular bookish and subject-centred education, he drew the attention of the delegates to this conference towards the need for a work-based and life-centred education that takes into account the needs of both the child and the society he is a member of the effective launching of this kind of education at the Jamia Millia Islamia many years ago had only enhanced his faith in work cenred education and had made him to put forth his ideas in this regard more emphatically. While speaking in this Conference he had said :

"...True learning can be imparted only through doing. Children have to be taught various subjects through mannual work, no matter whether one believes in urban or rural civilization. Upto the age of thirteen the children want to do and undo, break and mend things. This is how nature educates them To ask them to sit still in one place with books is to do violence to them". Perhaps for the reason of this strong conviction of Dr. Zakir Husain in work-based education. Mahatma Gandhi chose to assign him the responsibility of heading the famous Wardha Basic Education Committee which was entrusted with the task of

The most distinctive quality of Zakir Saheb was his deep humanitarianism. He showed due consideration for all the workers of the Jamia—heads of the institutions, teachers, administrative staff and the junior staff. He felt concern for the welfare of all his colleagues. He would sense it if anyone was facing some difficulty and do whatever he could to lessen it. This reminds me of an occasion when a colleague's wife felt embarrassed to go back to her home town for want of proper clothes. Those were the days when the Jamia could not pay its teachers even for their bare necessities of life. Zakir Saheb somehow sensed it, and managed to advance some money for the purpose. He continued to feel for his old colleagues in the Jamia the same way, even when he was not formally concerned with the day-to-day matters of the Jamia. When he was serving as Vice-President of India, and the Jamia had to make rules for the retirement of its teachers in pursuance of the recognition of the Jamia as a demeed university, his mind was very much exercised over the plight of some of his erstwhile colleagues after their retirement, who would have little to fall back upon.

and recognized his worth. This is the secret of the love and regard that the Jamia *Biradari* (community) extended to him.

Zakir Saheb was an astute dialectitian. If you approached him for a discussion on 'men and matters,' he would deliberately take an opposite stand and advance his arguments to refute your views. Thus, he would try to fathom the depth of your thinking and to gauge the strength of your position. This encounter would generally culminate in identification of weaknesses in the rationale, and clarity of thinking.

Essentially a man of ideals, as he was, Zakir Saheb combined his idealism with the robust common sense which he possessed in ample measure. He believed that after all it was the man who was decisive in everything that was aimed at and planned. One could not build castles in the air. It was the human material that would ultimately determine both the nature of the effort that could be made and the success that could be achieved. That is why he would advise us to attempt such projects as we could pursue with the human and the material resources we had. He possessed a penetrating insight into human affairs. He could make almost a correct estimate of a man's worth, his assets and liabilities, his potentialities and limitations. In the light of his estimate, he would assign the right task to the right person and at the right occasion. And this procedure was doubly blessed. The task was completed successfully, on the one hand, and the person concerned found an opportunity for self-realisation, on the other. That is how he helped to make writers out of those who had earlier dared not to publish anything; creative teachers out of these who had neither adequate academic nor professional background; and educational administrators out of these who were quite freshers in the field.

Whether Zakir Saheb himself ever claimed to possess power of intuition is a controversial matter. Some of his close associates asserted that he was endowed with such a power that made him do certain things for which there was no objective basis or rational ground. But even in regard to such things one might say that those of his acts which are credited with intuition were an evidence of his superior intelligence that enabled him to see far ahead. So sharp was his intellect that he at once got at the crux of the problem that confronted him, and took steps accordingly. As there was apparently no justification for such action, it was attributed to what is called 'intuition'. People who came in contact with him have sometimes realized that he discovered their real intention in the first few statements even if those were made in a well-guarded language.

Zakir Saheb : Some Recollections

Dr. SALAMATULLAH

Retd. Principle, Teachers College, Jamia

He left the Jamia in 1948 to join the Aligarh Muslim University; and ever since he had been physically cut off from us except for a few occasions when he paid us a casual visit. All the same, we kept on feeling his presence around us. His influence was manifest both in our thinking and doing. And it is not a matter of surprise, for, most of us were attracted to the Jamia in our youth by the magnetic personality of Zakir Saheb. Some found in him a source of sustenance for their religious and moral values, while the others looked upon him as a symbol of nationalism and left inspired by his struggle to evolve an independent system of education suited to the dignity of a free people.

To most of us, Zakir Saheb was a friend, philospher and guide, all rolled into one. We had so much confidence in him, and he was so unassuming, that we would turn to him for his advice even in our most intimate and personal affairs. We could discuss anything with him without hesitation. If one did not feel convinced with his point of view, he was gracious enough to tolerate disagreement. He would never try to force his views on those who differed.

This reminds me of certain encounters I happened to have with him in advancing some causes in my youthful enthusiasm. But that did not affect his judgement of my conduct adversely; and I received all consideration and support from him subsequently. He was a mode of a self-disciplined man. Even the most un-called-for provocation would not unhinge him. He could exercise control over himself in situations which would generally drive others to exasperation. That is why people in the Jamia used to say, "Zakir Saheb has an unlimited capacity for tolerance."

He developed a unique way of dealing with his colleagues. It was the intimate and personal way. If he suspected that a particular decision would not be acceptable to a person, he would visit him at his place and confer with him as persuasively as he could; and often he would succeed in making it palatable. He endeared himself, to everybody through this kind of approach. Everyone had the feeling that Zakir Saheb cared for him

Indian Public Schools Conference at New Delhi in 1968, Dr. Husain said, "The unity of the country has to be built within its educational institutions. The curriculum of our schools, colleges and universities must be so formulated and taught that every student will have an understanding of our inheritence, of the problems that we are facing at present. It must also give every student a pride in our past." Even in the context of public schools he had pointed out that these must have an All India Character and must make significant contribution to national integration. In his address to the Utkal University in 1968, he opined, "What is even important, they should evolve programmes of national service which would enable teachers and students to participate in challenging and worthwhile programmes of community or national service with a view to inculcating in the rising generation, a love of the motherland, a commitment to national development and a sense of social responsibility."

The concept of Pace-setter school in the National Policy on Education is again an echo of his plea that the nation must provide free education of high quality to the talented minority living in rural areas and to the weaker sections of the society. The National Policy on Education in its clauses 5 : 14-15 clearly stipulates that children with special talent or aptitute should be provided an opportunity to proceed at a faster pace. Moreover good quality education should be available to them irrespective of their capacity to pay for it. The broad aim of pace-setting schools will be to serve the objective of excellence, coupled with equity and social justice.

The proposal of setting up Rural Universities in the New Education Policy has been referred to under clause 5 : 42. Such universities are to be set up on the ideals of Mahatma Gandhi. Dr. Husain also expressed the same opinion while delivering the convocation address at Sri Ram Krishna Mission Vidyalaya Rural Institute, Coimbatore in 1961. In his own words, "It reminds me of my personal association with the discussion of the University Education Commission, more than a decade ago, in regard to the establishment of the Rural Universities."

To conclude, be it universal elementary education, non formal education, education of the weaker sections of the society, science education, vocationalisation, pace-setter schools, or education for national integration, the views of Dr. Zakir Husain Sahib clearly find their reflections in the National Policy on Education, 1986.

activity. The first two activities did not aim at producing anything outside the child or any quality in the child, for it was its own reward. It could be professional or just the physical exercise. The third activity originates in play and stops at mere casual occupation which is the fertile breeding ground of the dilettante. The chief purpose of the educative process is to lead it on to the fourth form of activity, namely work. In this connection he differentiated manual work from educative work. For him, manual (physical) work even when accompanied by eagerness and interest cannot be educative work. He believed that educative work has normally four stages : (1) The clear consciousness of the problem, what exactly is to be done, (2) the formation of a plan of work, the choice of appropriate means, thinking out the various steps in which it has to be accomplished (3) the actual execution of the work, and (4) self-criticism of the work done in the light of what exactly had to be done. On a simple analysis it can be seen that barring the third stage, all others are based on mental exertions. An immediate question that crops up before our mind would be its relevance to the State and the individual. For him, the State has two kinds of aim before it : (1) the egoistic aim of peace and security inside, defence against aggression and care of the physical and moral well being of its citizen, and (2) the establishment of a Human World by itself, growing morally, to develop into an effective instrument of bringing about co-operation among the like-minded people.

Accordingly he has laid down the following two objectives : (1) to educate the citizen towards some useful work for a definite function in tne society compatible with his capacity and aptitude. (2) to make vocational education a moral experience and to enlighten the learner that a vocation is not only a source of earning a living but is indeed an office of public service, an organised co-operative community and should be in the service of the growth and development of a moral social order. Earlier he had maintained that the choice of craft should invariably be linked with the local and regional needs. In rural agrarian society, for example, it should be linked with agriculture. It should not be difficult, therefore, to conclude that Jamia Millia Islamia, under the auspices of Dr. Husain had long back put vocationalisation in practice which has been envisaged in the National Education Policy, 1986.

Another thrust of this policy has been on the question of strengthening democracy and bringing about national cohesion and national integration. For this, it has been suggested that education should incorporate the history of India's freedom movement, the constitutional obligation and other content essential to bring about national indentity. Inaugurating the

cial cases. Vocational courses should be related to health, agriculture, marketing, social services etc. These should also be offered to semi-literates, school drop-outs, unemployed or partially employed persons, and even to the graduates passing from the academic stream side. The main objective of vocationalisation in education is that the future citizens of our country should be busy in productive work which will be according to the principal : work more so as to produce more, produce more so as to earn more; earn more so as to have more. The prosperity of our nation lies in production and not in creating a nation of unemployed person, whether educated or uneducated. Likewise Dr. Zakir Husain also wanted all schools to become centres of work and then spread this influence to the entire society. The Holy Quran has also given a mandate that labouring in fields was not a punishment.

Mahatama Gandhi had realised that one serious national ailment at that time was disrespect to manual work It was rather detested and it had created two distinct classes of workers : first, workers who were considered inferior and second, non-workers who were considered superior though parasites. He knew that the best way to fill the gap between the two was through teaching a craft and/or providing a craft-centred education. Moreover, in the absence of government monetary help, self-supporting concept of education was a dire necessity, otherwise the idea of universal compulsory primary education would have been an impossible dream. However, Dr. Husain would never accept an unacademic proposition. He came very heavily on the danger of over-emphaizing the self supporting aspect of education. In his own words, "Teachers may become slave drivers and exploit the labour of poor boys. If this happens, the 'takli' will prove even worse than books. We shall be laying the foundations of hidden slavery in our country. I know that the government does not have sufficient funds to spread compulsory universal education. If the government tries to do so, it will soon become bankrupt, but this bankruptcy will be preferable to the bankruptcy of national energies.[7]" While he was against the possible exploitation of the dividends arising out of the productive work of the students, he was very keen on introducing educative work in the school programme. He was all out to restructuring the school curriculum to include the component of educative work.

The Educative Process

Dr. Husain classified the activities of children under four heads namely, play-activity, sport-activity, casual-occupational-activity and work-

7. Quoted by Noorani, "President Zakir Husain' pp. 75-76.

It is not difficult to conclude, therefore, that science education is expected to emphasize the following :

(i) inculcation of scientific attitude

(ii) teaching science through project method.

(iii) teaching science through correlation.

(iv) linking science with production.

The views of Dr. Husain are quite pertinent in this direction. In his opinion science does not only mean demonstration in instruction, but in knowing also. Science for him is a part of knowledge for social utility. In Islam, Education which does not result into gain is like a treasure which is not spent as per directions of Allah, the Benefactor. Here the word 'gain' does not have its usual monetary sense but the sense of 'Social progress', which in turn is possible only through the spread of science education. Dr. Husain while inaugurating the new building of the Institute of Engineering, Calcutta in 1968 pointed out in clear-cut words that "We require more houses, more schools, more hospitals, more roads, more food, more factories—in fact more of every amenity that makes for a civilised existence. The transformation of a traditional society into a modern one is the job of science and technology." He practically was the first and the last Indian educationist to carry out teaching through the project method in Jamia Millia Islamia. Through the project method, it is so easy to acquire problem solving and decision making skills. He had also emphasised in the scheme of Basic Education that 'correlation should be made between the subject and the life around, between the subject and the craft and between different subjects. Careful adherence to this procedure leads to sure inculcation and development of scientific attitude in students which in fact is the need of the hour today. Needless to say that the present National Education Policy vis-a-vis Science Education under para 8.18 and 8.19 is nothing but a different expression of what he had said earlier. After all, adopting the Project Method in Jamia Millia was not merely accepting an American system but also accepting the spirit beneath it and that was developing scientific attitude through problem solving alongwith the spirit of enquiry.

Another important dimension of National Policy on Education has been Vocationalisation. This has been discussed under clauses from 5.16 to 5.23. The analysis clearly brings out that vocational education is essential for educational reorganisation. These courses are usually to be offered after the secondary stage but could also be offered after class VIII in spe-

Dr. Husain, as early as in 1958, pointed out in his radio talk thus. "... our future as a people will depend in no small measure on the ideas and principles which inspire Indian Education, and how its evolution helps in the development of the democratic way of life ....." Still back in 1937 he was chairing a committee of educationists appointed at the First Conference of National Education held at Wardha. Even prior to that, in 1935, while addressing the convocation at Kashi Vidyapeeth, he had opined, "National Education should preserve the national heritage. A nation's history does not survive by the written word, but only if it lives in the life of every individual. It relates the past to the present. Even as human life becomes useless, once memory is lost, so is the national life endangered, if the past is forgotten. If India wishes to retain its identity in the comity of nations and to contribute its own distinctive qualities to the rest of mankind, it is surely its duty to keep those qualities alive and so manage its education that legacies of its past are transmitted to future generation." Thus it is not difficult to conclude that Dr. Zakir Husain's message of national system of education, given as back as in 1937, found a prominent and cardinal principle in National Education Policy.

Science and Technology

Another priority that has been recognised in National Education Policy is the role of science and technology. In the policy perspective, 'Challenge of Education', it has rightly been observed that "The country now stands on the threshold of the twenty-first century. Those who are being born now, will finish their elementary schooling at the turn of the century and enter into a world which will, it is clear, offer opportunities unprecedented in the history of mankind to those who are equipped to cope with the future challenges and the accelerating pace of change." One important role of education has been to create a scientific temper and independence of mind. While refering to science education, the National Education Policy has clearly laid down under clause 3.18 that science education will be strengthened so as to develop in the child well defined abilities and values such as the spirit of enquiry, creativity, objectivity, the courage to question, and an aesthetic sensibility. Science education programmes will be designed to enable the learner to acquire problem solving and decision making skills and to discover the relation of science with health, agriculture, industry and other aspects of daily life. Every effort will be made to extend science education to the vast numbers who remain outside the boundaries of formal education.

His love for Islam can be gauged from the fact that he refused to seek financial grants from the Government and donations from the public (when Jamia Millia was in financial crisis) on a suggestion that it would be easy to obtain money if he dropped the word 'Islamia' from Jamia Millia Islamia so as to give it a secular appearence. How could he agree to it, when the holy Qur-an had clearly laid down that believers will not leave the right path even if financial baits were there or even if shortage of finance was there ?

His sensitivity to nationalism is much more strong. He left Aligarh Muslim University under the spell of Gandhiji, jeopardising his own academic career and thus devoted his total life to the service of his country In the words of K.G. Saiyidain, "He was of the view that a genuine and broadbased national renaissance could not be ushered through the narrow gate of politics It must have its moorings in, and draw its inspiration from a new approach in education and culture and a new pattern of national character." He was always associated with important national committees and bodies on education like the Central Advisory Board of Education, the University Education Commission, the University Grants Commission and the Basic National Education Committee. As a member of these committees he always pleaded for the cause of a truly Indian theory and practice of education. He wanted to evolve a national system of education, for the prevailing system of Indian Education was chaotic. In his own words[4] "Indian Education has been like a stagnant pond for quite a while, and with freedom to do something about it, so many ideas have been flung into it that waves seem to cut across each other in an almost bewildering complex pattern." R. P. Singh has also said,[5] "Dr. Husain is actually conscious of the need for having a national system of education, where people irrespective of class, religion and caste have their own rightful role to play...... .. He is anxious to let education have as broad a base as possible."

The National Policy on Education 1986 clearly sums up the essence of education under Unit 2 'A' which goes as follows.

"In Sum, Education is a unique investment in the present and future. This cardinal principle is the key to the National Policy on Education."[6]

---

4. Fducational Reconstruction in India, p. 112.
5. R. P Singh, Zakir Husain. Sterling Publishers Pvt. Ltd., Delhi, 1968, p. 24.
6. Noorani, A.G., President Zakir Husain, Hind Pocket Books, 1967, p. 69.

Dr. Zakir Husain and the National Policy on Education, 1986

Dr. Harbhajan Singh Sech*

It is inspiring to find the reflections of the educational views of Dr. Zakir Husain in the National Policy on Education, 1986. To my mind, the formulation of this policy is nothing but a partial fulfilment of his views, and I am sure that even the forthcoming educational policies will be more or less based on his views with some modifications caused by the changing times. An attempt has been made in this paper to trace those reflections in the new National Policy on Education.

Dr. Zakir Husain has shown great sensitivity to his religion 'Islam' as well as to nationalist ideals. It is evident from the name of JAMIA MILLIA ISLAMIA (National Islamic University). He helped its establishment in 1920 and subsequently (in 1926) took over as the Vice-Chancellor in the hour of crisis. He held this position till 1946, by which time the crisis had practically passed out. Leaving Aligarh Muslim University and joining Jamia Millia Islamia was his only conscious decision of life, while the other decisions only flowed from it. During his entire life, he sought guidance from the Islamic thought, ethics and philosophy. At the same time, he blended his Islamic thoughts beautifully with his views on nationalism.

He knew that "the Creator and the Benefactor of the Universe has created me, and on this account he will also show me the right path".[1] The right path for him was to serve the Jamia and the sincerity of his purpose was unquestionable. He was equally aware of the message of the Prophet Mohammad Sahib that "Read and repeat what others say after taking his name."[2] Thus receiving education and propagating the spread of education is a religious obligation, a sacred duty for every Muslim Dr. Zakir Husain being a devout Muslim stood by the revelation of God through Hazrat Mohammad Sahib. He knew that "God teacheth man that which he knew not, and teacheth him by the pen."[3]

---

*Presently Principal, Khalsa College of Education, Amritsar and Dean, Faculty of Education, Guru Nanak Dev University, Amritsar.

1. Holy Quran 26 : 78.
2. 96 : 1.
3. 96 : (5, 4, 3).

they will always be guiding them. Our new Education Policy has come out with many proposals recently. In order to make them a practical reality, the educational ideas of Dr. Zakir Husain are bound to be found immensely useful by our teachers throughout the country, for the new Education Policy and Dr. Zakir Husain both are clearly concerned with making education a real instrument of cultural synthesis, national integration, modernization and our society's smooth transition to a glorious future.

The worth of the Utopian experiment of building Jamia with the support of dedicated workers amidst poverty and deprivations of all sorts shall always be recognised by the people of India. That was indeed a very romantic story full of great message and inspiration. The credit for it must go to Dr. Zakir Husain in a large measure. But more than that, we must appreciate the sociological impact of that utopian experiment. During the last 66 years, the Jamia might have provided education to about a million first generation learners of the families of poor and middle class Muslims, Hindus, Sikhs and Christians coming from Indian villages, urban areas, slums and also from foreign countries. The Jamia has indeed helped these young men and women to achieve social mobility, modernization, enlightenment and emancipation in their lives. But for the Jamia, one shudders to think, what would have these boys and girls been doing and how ? Thousands of teachers in Basic schools were produced by the teachers' training wing of the Jamia during 1938-1986, and they indeed have been catalysts of educational change in the country. Hundreds of young boys and girls have become trained social workers, researchers, engineers and technicians by receiving low-cost modern education in the Jamia. While the other universities in Delhi and outside have been preferring students from elite or better-off families, the Jamia has since its inception continued to embrace the poor or weaker sections of the Muslims and Hindus and others in a very large proportion.

Let us not forget that the Jamia blazed the trail of Adult education several decades back as a pioneering institution under Zakir Husain. Also it was Jamia which produced useful literature in Urdu and Hindi languages.

Although in recent years, due to several external and internal factors much of the old spirit of the Jamia, which Dr. Zakir Husain and his contemporaries tried their best to create, has indeed been lost and a serious void seems to have come in, which unfortunately has given rise to several sociological and academic problems in the Jamia, yet the sacrifies and educational contributions of Dr. Zakir Husain still offer light and encouragement to those of its workers who seek it. The life work of Dr. Zakir Husain presents an inspiring example before all teachers, and the worth of his educational contributions will ever increasingly be appreciated by the nation.

(3) Instead of tinkering with administrative detail or making minor changes in years, subjects or books, "a deeper and more widespread understanding of the nature of education and the functioning of the democratic society is essential. ."[21]

(4) "Atleast a seven year compulsory school of work organised as community...transformed from a place of theoretical one-sidedness to that of practical human many-sidedness, from a place of passive book learning to one of active, purposeful work......, supplemented after the age of 14 by continuation vocational institutes with compulsory part-time attendence upto the 18th year of age..."

(5) The school should seek to shape the totality of the educand's being,[22] that is, the entire Values-Aims-and-Interests system of the educand.

(6) "...organization of our educational institutions as units of community living, as communities of work, manual and mental, and as communities of shared values and shared standards of excellence."[23]

(7) The functions of the university should be liberally interpreted. Liberal education is the right base for efficient and socially motivated technical education.

(8) A good school is one which :

a) Never forgets the individual with his peculiar needs;

b) Keeps in view the stages of development of this individual;

c) Attempts to make an alround development of the child as its primary function;

d) Is a place of purposeful activity of educationally productive work;

e) Is a community in which individual accomplishment is selected to social achievement, and

f) Initiates children into self-education.

IV

The Educational Impact of Dr. Zakir Husain

It is difficult to assess the ultimate impact of Dr. Zakir Husain's Jamia experiment and his educational ideas adequately. Somethings are very clear. So far as his ideas are concerned, their wisdom, brilliance and utility have always been recognised by enlighted teachers and parents and

21. **Educational Reconstruction in India, pp. 10-11.**
22. **Ibid, p. 33.**
23. **Ibid. p. 105.**

"...To some in history is given only to demolish, some are destined to make minor alteration, others are required to keep an edifice in good repair. It is given to you to build.. ".[19]

"..I maintain that the teacher is responsible not only for himself but, in a way, for the whole of society. He is the custodian of the highest values created and cherished by his people. He is the transmitter of those values to his students, and if he has not experienced them himself, has never been stirred to the depths of his being by atleast some of them, he is, I am afraid, in the wrong place."[20]

Needless to emphasize that these valuable addresses to our teachers shall ever remain as constant sources of inspiration and guidance to them.

Functions of Universities :

According to Dr. Zakir Husain, the prime concerns of our universities should be :

(a) Their concern with the individual and the spirit;

(b) To mediate between the subjective mind of the educated and the objective mind concretised, crystallized, as it were, in goods of culture;

(c) To be clear as to the goods of culture with which it brings its students in contact, and in what sequence and with what intent;

(d) Their concern with intellectual work, for knowledge should be based on the principles of experience and discovery; and,

(e) Their concern with individual experience as future, long term policy in order to make an excellent society.

Educational Reconstruction in India :

Dr. Zakir Husain was actively and creatively involved in the task of educational reconstruction in India throughout his long educational career. We have culled his following prescriptions for a functional reconstruction of Indian education from his various speeches and writings :

(1) Make education the instrument of essential culture through educationally productive work.

(2) Create a sense of social responsibility in all engaged in the task of education.

---

19. Educational Reconstruction in India, pp. 95-96.
20. The Dynamic University, p. 53.

a 'play-thing' by elders. nor elders should allow the child to treat them his 'playthings'. Schools should not be 'dark places of education' whose sad memories might haunt them all their lives; they should cease to be "instruments of some devil" wherein the personalities and mirth of the children are mercilessly crushed. Individual differences in children should be recognised and provided for by teachers and parents. Dr. Zakir Husain believed that the "best educational results can only come if the appropriate avenues of receptivity in every child are brought into contact imaginatively with the corresponding cultural goods "[15]

Productive Work in Education :

Dr. Zakir Husain recognised the importance of productive work in education and insisted on its quality. According to him, "All work is not educative. It is educative only when it is preceded by mental effort. You have first to plan the work in your mind, then to think out the ways and means and ways of doing it, then to perform it actually and finally to assess the results and compare them with the guiding plan .....Only that work is genuinely educative which serves some higher value, higher than our selfish ends, and to which we are devoted "[16]

We are having SUPW (Socially Useful Productive Work) in our schools as a subject now, but it is a mute question before all of us whether the work being done in the name of SUPW meets these five acid tests or criteria of Productive work given by Dr. Zakir Husain.

Role of Teacher :

More than any other Indian educationist, leader or thinker, Dr. Zakir Husain understood the teachers of India—their roles, their weaknesses and failings. their aspirations, emotions and capacities and their historical destiny. Quite naturally, therefore, he exhorted the teachers and guided their minds and actions. Let us recall some of his most-remembered statements :

> "...The frontispiece of the (good) teacher's book of life does not bear the legend **knowledge** but **love**."[17]
>
> "...The growth of the morally autonomous personality is the aim and end of his endeavour."[18]

---

15. Saiyidain, Op Cit, p. 186.
16. Zakir Husain's address to All India Education Conference, 1940; Quoted in Saiyidain, Op Cit, p. 192.
17. Quoted in Saiyidain, Ibid, p. 194.
18. Educational Reconstruction in India, p. 93.

ded to teachers to plan, innovate, act, teach, change and speak. He wanted freedom to be enjoyed by university teachers and executives to think, act and express. He wanted freedom to be allowed to all citizens of the country to grow according to the abilities, at their pace, harnessing the richness of their cultural milieu.

He advised teachers and parents not to spoil children under their charge by terror, dogmas, indoctrination, execussive love, over-protection or forced unproductive educational work, but to help them. serve them and understand them in "Faith, Love and Reverence".[12]

Never had anyone in India before Dr. Zakir Husain given such a courageous statement about the inherent freedom of the university teachers and functionaries as he did while giving his Convocation Address at the Punjab University in 1960 :

> "...these (teachers, students and administrators) can function fruitfully if they all have the feeling of being free, responsible members of a free academic community—free to think, free to express their thoughts, free to refuse to conform, free to be unorthodox, free even to err. ...It is only in such freedom that one develops that invaluable quality, moral courage, to speak out freely, frankly and fearlessly when the moral good of society is involved.
>
> ...Universities are houses of ideas ; enquiry and challenge are their function ; to question established patterns is almost their business in a progressive society. Let society ensure that they can perform this function untempered and unmolested."[13]

Dr. Zakir Husain, however, did not fail to remind us that "Freedom is never given, it is earned, and kept only by those who continue to earn it every minute of their active live."

Nature of the Child :

His concept of the childhood is a romantic one and at the same time very much psychological. He considers that the child is full of innocence, vitality, activity, and unlimited potentialities to grow. The child craves for freedom, joy, play and creativity. The growth of children should not be curbed or blunted by our insensitivity. The child is not a 'mass of wet mud' whom one may give any shape he likes; he should not be treated as

12. Ibid, p. 15.
13. The Dynamic University, Op Cit, pp. 52-53.

the greatest experiment of cultural synthesis will be undertaken and successfully completed. India' mission in the world history seems to one to be evolution of a distinct type of humanity, combining and harmonising in itself the lives of the diverse types which history has produced, all blended together to form a new type that might evolve a characteristic and, perhaps, more satisfactory patterns of civilized existence than those in vogue at present."[8]

From such a belief emerged his conception of the Indian State :

"...(Our) State is the expression of our collective strength, the condition of our ordered and peaceful strength, the symbol of our co-operative endeavour, the embodiment of justice and morality, the promoter of our excellence, the custodian of all that is good in our past, and the guarantor of our future destiny."[9]

These quotations clearly point toward the challenges Dr. Zakir Husain earnestly wanted our educational system to take up.

Secularism :

Dr. Zakir Husain held that "We are secular because that is the only sane policy that we can have in a multi-religious society. Secularism does not mean irreligion but equal respect for all religions."[10]

He believed that "...If we in this land, speaking different languages and representing different cultures learn to live in harmony and peace, we will, in our own way, be able to set up a good example to others of understanding and reconciliation."[11]

There can be no better, clearer, simpler and more authoritative explanation of the concept of secularism in India than this

Freedom :

In the long history of four thousand years of Indian education right from the days of the Vedic Gurukulas, never was the concept of freedom in education and civic life contemplated and so vigorously advocated till Dr. Zakir Husain championed its cause in the 1920's and 1930's. He wanted freedom to be given to children to grow, think, create, play, enjoy and appreciate nature and culture. He wanted freedom to be affor-

8. Zakir Husain, The Dynamic University, Bombay, Asia Publishing House, 1965, p. 20.
9. Ibid, p. 70.
10. President Zakir Husain's Speeches, New Delhi, Publication Division, 1959, p. 121.
11. Ibid.

Husain in which he gave expression to his most cherished ideas on the various thems of Indian education. Although he commented on a variety of educational themes, my study of his writings reveals to me that his most favourite themes have been the following :

1. Aim of Education
2. Cultural Synthesis
3. Secularism
4. Freedom
5. Nature of Child
6. Productive Work in Education
7. Role of Teacher
8. Functions of University
9. Educational Reconstruction in India

Let us briefly recall how sharply he reacted to these vitally important themes of this century's Indian education :

Aim of Education

Convinced at heart that a cultured human being is the end of educational product, Dr. Zakir Husain defined education as "the individualised subjective revivification of objective culture. It is the transformation of the objective into the subjective mind. It is individually organised sense of values awakened by goods of culture which are embodiments of the values accessible in experience to the persons concerned."[7] He was thus a votary of the cultural aim of education. In his curricular design for schools, music, art, dance, drama, games, sports, cultural celebrations, social service and the like were given central position. We are new vigourously advocating the case of 'Education in Human Values' forgetting to give due credit for it to Dr. Zakir Husain who indeed pioneered it 40 50 years back.

Cultural Synthesis

Dr. Zakir Husain's commitment to cultural synthesis is transparent from his following heart-felt words :

"...Something deep down in me seems to furnish me with the belief that Providence has destined India to be the laboratory in which

7 Zakir Husain, **Educational Reconstruction in India**, Delhi, Publication Division, 1959, p. 17.

The picture of the Utopia that the Jamia was during Dr. Zakir Husain's days can best be compiete by the following realistic, poignant and vivid sketches drawn by Dr. Zakir Husain himself while delivering the Convocation address in the Jamia in 1964 :

> "My old colleagues will remember that the time we passed together was one of great hardships, but I feel that the days of poverty and deprivation were also days of happiness. There was a longing to build and nothing to build with There were no resources, but only the will to achieve. We had an ideal before us and our hearts were filled with a spirit of dedication There was no desire for the exercise of authority, only a determination to attain excellence in our work. We desired the rapture of devoted service and had no time to think of monetory compensation In the eye of every child who came to us we saw the image of freedom."
>
> "...The only correct and effective way to bring Hindus, Sikhs and Muslims together and to make them brothers and comrades is the way adopted by the Jamia Millia."
>
> ".. It has been a tradition of the Jamia to allow full freedom of thought and speech, and to pay as much regard as possible to individual teacher."
>
> "...The Jamia campus offers a picture in which work and pleasure, freedom and concentrated endeavour are combined in attractive composition ."
>
> ". In the Jamia, education has from the beginning been a kind of culture. While from one point of view this education could be regarded as a process of increasing the knowledge and developing the attitudes of the young, it was from another point of view an attempt to induce the young to cultivate pleasing and socially valuable qualities."[6]

This then is the moving story of the great utopian experiment in Indian education conducted by Dr. Zakir Husain. Herein he experimented with his ideas and perfected them. Jamia was thus the workshop of this great socially-oriented humanist turned educationist.

III

The Key Ideas of Dr. Zakir Husain

Let us now turn to our other source—the writings of Dr. Zakir

6. Dr. Zakir Husain, Convocation Address. New Delhi, Jamia Millia Islamia, October 29, 1964.

that attracted people of diverse backgrounds—communists as well aristocrats, upper as well as lower caste Hindus as well Christian and Muslims to become his workers on egalitarian socio economic footing, and fuse their hearts and minds into one and contribute their very best to make the Utopia a practical reality.

Conducted in the culture of poverty, nobility of goals and high degree of commitment, this utopian experiment in the Jamia under the leadership of Dr. Zakir Husain was in no way lesser in significance than the experiments of Gandhiji at the Tolstoy Farm, Phinix Farm etc.

Many new ideas and practices were actually initiated in the Jamia. Basic Teacher's Training Institute started in 1938 emphasized craft work, community living, co-curricular activities, working with the community, correlation, and internal assessment In the Jamia school, encouragement was given to "the study of local environment, contact with the local community and creative projects of social service which were later incorporated in the scheme of Basic education."[3]

Saiyidain informs us that other features which found acceptance in many experimental and national schools as well as public and government schools "included recognition of the principle of activity in learning and formation of character, the social orientation of the educational forces and the encouragement of a spirit of experimentation in teachers who were enthused to work as pioneers of a new movement rather than as ill-paid mercenaries."[4]

The Jamia tried Project method, encouraged self-government among students and promoted art, spirit of idealism and social service.
Dr. Mujeeb Ashraf rightly reminds us :

> "...The focus of education in the Jamia was by no means to maintain the separate identity of the Muslims, so much as to instil genuine nationalistic and humanitatrian values among students Dr. Zakir Husain always felt that if a person was proud of his creed, whatever its form, he should be equally proud of being an Indian.
>
> ...The suave, out-going person that he was, the Vice-Chancellor employed tact rather than authority as a pedagogical approach, and his style of functioning was so infectious that an informal yet disciplined atmosphere pervaded the campus."[5]

3. Saiyidain, Op Cit, p. 179.
4. Ibid, p.
5. Mujeeb Ashraf, Op Cit.

as many as ten courses, right from Basic Teacher's Training Course for the primary teachers to M.Phil. (Education) course and Ph.D programme

The Enchanting Utopia that the Jamia was!

When Dr. Zakir Husain took up the reins of the Jamia in 1926, there was a great scarcity of funds. "The Jamia was constantly plagued by financial problems, so much so that its closure was imminent. During those trouble-ridden years, Zakir Husain taught on a measly salary of Rs. 75 per month while his colleagues drew double the amount. His belief in the role of the Jamia as an integrating force persisted, and he was determined that the work should not collapse. His personal lobbying with philanthropists led not merely to its revival, but the establishment of a fund of over Rs. 2 crores."[2]

Since funds were scarce but commitment to nationalism and the pedagogical ideas of the 'New Education' movement and the Basic National System of Education was intense in the hearts of Zakir Husain and his colleagues in the Jamia, their all attempts to conduct the educational experiment in fact turned out to be a big and endless series of problem-solving ventures. It is in this context that low cost educational practices, materials and teaching strategies were invented, adapted and tried, and original and indegenous ideas for a functional reconstruction of Indian education were developed A unique socialist society was established in which all teachers were paid equally. Amidst great personal inconveniences and deprivations in dusty, rural, mosquito-ridden, isolated surroundings, these teachers flocked together to work under the dynamic leadership of Dr. Zakir Husain. His leadership was charismatic and it had many superb traits—his open-mindedness, his congeniality and warmth of heart, his sensitivity to the nature and needs of the children, problems and potentials of his teachers and workers, and the needs and aspirations of the Muslims in particular and the Indian society in general, his unique strategies of establishing human relationships and exacting higher standards of professional work form his colleagues, his humour, his cordial praise to good workers and very critical criticism of slack workers, his prophetic wisdom and advice, his keen desire to implement new pedagogical ideas into actual practice, his haste in getting things done well, his transparent sincerity, his belief in humanity at large, and, above all, his being completely free from the narrow considerations of religion, caste, class, locality or political affiliation. It was this magnetism of his charismatic personality

2. Mujeeb Ashraf, "Zakir Husain—An Educationist", The Hindustan Times, January 17, 1987.

(1) During the Khilafat or Non-Cooperation movement in the country's struggle for freedom, in response to Gandhiji's call to boycott the British government supported educational institutions, Jamia Millia Islamia was founded at Aligarh in 1920. Among those who enthusiastically responded to this call were Maulana Mahmud Hasan, Maulana Mohammad Ali, Hakim Ajmal Khan, Abdul Majid Khwaja and young Zakir Husain. These eminent personalities along with others founded the Jamia which moved from Aligarh to Delhi in 1925. Dr Zakir Husain was appointed as the Vice-Chancellor of the Jamia in 1926 and thus the responsibility of keeping alive this newly-established national university against all odds fell on his shoulders.

(2) Zakir Husain went to Germany to do Doctorate in Economics for a few years between 1921 and 1925, and there he came in contact with a number of German educational thinkers. He came under the great influence of German educationist Kerschensteiner and a number of other champions of the 'New Education movement' in the West, such as Dewey, Nunn, Kilpatrik, Spranger etc. From them he learned many valuable educational ideas related to child development, Project method of teaching and learning, community approach to teaching and learning, Productive work, Idealism, Freedom, and social and national service. These ideas became articles of faith with him, and they guided him in conducting the *Jamia experiment and in his expressions at all times.*

(3) In 1937, Gandhiji gave out his ideas on Basic Education to the *nation, and soon thereafter, when Indian political and educational* leadership got up to do something concrete in that direction, it fell to the good lot of the Jamia's young and energetic Vice-Chancellor Dr. Zakir Husain to be picked up by Gandhiji to act as Chairman of the Basic National Education Committee. "He took Gandhiji's rough hewn ideas and gave them an educational mystique as well as appropriate techniques of work. He linked practical work with intellectual work in a fruitful union ...."[1]

It was in this context of the newly developed enthusiasm for Basic education that under the inspiring leadership of Dr Zakir Husain the Teacher's Training Institute to train teachers for Basic schools was established in the Jamia in 1938 On this account the Jamia became famous overnight in the educational world. That Teacher's Training Institute became Teachers College after Independence and in 1980 it grew into a full-fleged Faculty of Education having three departments which now offer

1. K. G. Saiyidain, **The Humanist Tradition in Indian Educational Thought.** Bombay, Asia Publishing House, 1966, p. 179.

The Educational Contributions of Dr. Zakir Husain

By : Professor S P. RUHELA

Head, Department of Teacher Training & Non-Formal Education
Jamia Millia Islamia, New Delhi-110025

I

As soon as we start thinking of the great educationists of India who lived and influended us in this very century, the names of Mahatma Gandhi, Dr. S. Radha Krishnan and Dr. Zakir Husain instantly appear and dance before our mental vision. In the trinity of Indian educationists, Dr. Zakir Husain holds a unique place, for he not only combined in him the genuine patriotism and pragmatism of Gandhiji and the wisdom and idealism of Dr. Radha Krishnan, but even more than them he had his own distinct charismatic personality of an inspired, dedicated, creative and practical educationist committed to change the Indian society through the instrumentality of a functional sort of education.

To write about his educational contribution is a difficult and challenging task, for he did not leave behind many big books written by him. The books attributed to him are **Talimi-Kudbat** (Urdu), **Educational Reconstruction in India, The Dynamic University** and **President Zakir Husain's Speeches** and all these are collections of his speeches in different forums. While his colleagues in the Jamia Millia Islamia and the Aligarh Muslim University in which he worked as Vice-Chancellor for three decades from 1926, often tell us some interesting incidents about him, not many of them are in print. So our sources of information besides whatever is available in print is all that is known about the utopian experiment of developing the Jamia by Dr. Zakir Husain.

II

The Jamia's Utopia and Its Social Contexts

Let us recall that there were three prominant aspects of the social settings in which Dr. Zakir Husain's educational ideas originated, developed and were put into operation in the form of practically building up the Jamia in a Utopian manner :

Contents

ENGLISH SECTION

HINDI SECTION

URDU SECTION

TALEEM

Annual Magazine of the Faculty of Education
Jamia Millia Islamia

1987

Dr. Zakir Husain Number

FACULTY OF EDUCATION
JAMIA MILLIA ISLAMIA
NEW DELHI-110025